ISSN : 2394-5567

سہ ماہی ادبی جریدہ

دبیر

جلد : دوم
شمارہ : دوم
اپریل تا جون ۲۰۱۵ء

مدیر : احمد نوید یاسر ازلان حیدر

از

دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان.....

دبیر

سہ ماہی ادبی جریدہ۔

جلد۔۲ شمارہ۔۲

اپریل تا جون ۲۰۱۵ء

☆سرپرست☆

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی

صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆نگران اعلی☆

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی

شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆نگراں☆

ڈاکٹر انجمن صدیقی (لکھنؤ)

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علیگڑھ

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔ چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مقالے اردو ان پیج، یا ایم ایس ورڈ کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، شعبۂ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

ڈاکٹر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی، شعبۂ فارسی، یوسف اسلام کالج، جوگیشوری، ممبئی

ڈاکٹر محمد عقیل، بی ایچ یو، وارانسی

محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

ذوالنورین حیدر علوی

مدیر شش ماہی ''تصفیہ'' کاکوری

سید نقی عباس کیفی

مدیر سہ ماہی ''نقد و تحقیق'' دہلی

ارمان احمد،

مدیر سہ ماہی ''عرفان'' چھپرا، بہار

☆معاون مدیران☆

محمد توصیف خان کاکر۔ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

عاطفہ جمال، فارسی، لکھنؤ

مناظر حق بدایونی، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد حسن، تعلیم، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد انس، تاریخ، اے ایم یو، علی گڑھ

سارم عباس، فلسفہ، اے ایم یو، علی گڑھ

اشرف علی، ہندی، اے ایم یو، علی گڑھ

راجیش سرکار، سنسکرت، بی ایچ یو، وارانسی

محمد جعفر، فارسی، جے این یو، دہلی

سعد الدین، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

ریویو کمیٹی

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
پروفیسر شریف حسین قاسمی، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، دہلی یونیورسٹی، دہلی
پروفیسر ابوموسیٰ محمد عارف باللہ، ڈائرکٹر البیرونی فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش
پروفیسر عبدالقادر جعفری، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
ڈاکٹر نجم الرشید، شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

مجلس مشاورت

۱۔ پروفیسر شمیم اختر، صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس۔
۲۔ پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
۳۔ پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔
۴۔ پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، صدر شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال۔
۵۔ پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام۔
۶۔ پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
۷۔ پروفیسر وجیہ الدین، شعبہ عربی و فارسی، بڑودا یونیورسٹی، بڑودا، گجرات۔
۸۔ احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ۔
۹۔ ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
۱۰۔ ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، خانقاہ احمدیہ، مسٹن گنج، رامپور۔
۱۱۔ ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔
۱۲۔ ڈاکٹر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔
۱۳۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔
۱۴۔ ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور۔
۱۵۔ سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، آندھرا پردیش اسٹیٹ میوزیم، پبلک گارڈن، حیدرآباد۔

فہرست مندرجات

مقالہ	مقالہ نگار	صفحہ
اداریہ	مدیر	۴
۱۔فردوسی طوسی اور اسکا آفاقی شاہکار شاہنامہ	عارف نوشاہی	۵
۲۔خط کا سفر	محمد عقیل	۸
۳۔تذکرہ نکات الشعراء: ایک جائزہ	رعنا خورشید	۱۶
۴۔شاعر مست الست: رضوان سعید	فخر عالم اعظمی	۲۱
۵۔اودھ کا ایک فارسی شاعر: مظفر علی اسیرؔ	انجمن بانو صدیقی	۲۶
۶۔فرہنگ مشترک ہند کا علم بردار: داراشکوہ	محمد قمر عالم	۳۰
۷۔فوائد الفواد	شبیب انور علوی	۳۷
۸۔میرزا اکمل الدین حیات اور کارنامے	سرفراز احمد	۴۵
۹۔میر واحد بلگرامی اور تصوف	محمد عمر	۵۲
۱۰۔ناصر علی سرہندی اور ان کا کلام	ناظرہ اسحٰق	۵۷
۱۱۔حضرت محمد رشید مصطفیٰ عثمانی اور ان کی شاعری	ارمان احمد	۵۹
میراث خطی		
۱۲۔خلاصۃ التواریخ کے خطی نسخے	محمد ارشاد عالم	۶۴
۱۳۔ہندوستان میں ذخیرۃ الملوک کے اہم خطی نسخے	محمد ریاض	۶۸
دکنیات		
۱۴۔رفتید ولی نہ از دل ما	سیدہ عصمت جہاں	۷۵
آئینۂ تحقیق		
۱۵۔پایان نامۂ شعبۂ فارسی، الہ آباد یونیورسٹی	عابدہ خاتون	۷۸
چشم بینش		
۱۶۔شرح انتخاب قصائد خاقانی	نوید یاسر (مبصر)	۸۰

اداریہ

روشنی میری بہت دور تلک جائے گی　　شرط یہ ہے کہ سلیقہ سے جلایا جائے

عہد حاضر کے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے تعلیم وتعلم کا رواج بھلے ہی کم ہو گیا ہو مگر ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ چونکہ اسی زبان کی مرہون منت ہے لہٰذا اس زبان وادب کے ساتھ کتنا بھی سوتیلا برتاؤ کر لیا جائے ہندوستان اور فارسی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل ہندوستان میں اس زبان وادب کے اساتذہ کے کارنامے، طلبہ کا ذوق اور اداروں اور یونیورسٹیوں کا شوق ہے۔ گذشتہ تین مہینوں میں میرے کم یاب علم کے مطابق مختلف یونیورسٹیوں اور آرگنائزیشنس نے اس زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے جو کامیاب اور کارآمد سیمینار اور ورکشاپ منعقد کروائے وہ اس بات کی زندہ مثال ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی اور نیشنل مشنس آف مینسکرپٹ کے باہمی اشتراک سے ۲۔فروری تا ۲۲۔فروری ۲۰۱۵ء بعنوان ''مخطوطہ شناسی اور کتبہ شناسی'' ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا، جس کے کوآرڈینیٹر پروفیسر سید حسن عباس نے اس موضوع کی مناسبت سے اس کے ماہرین فن کو مدعو کیا اور شرکاء کے لئے بہترین مواد کی فراہمی میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ اس کے علاوہ، دہلی یونیورسٹی۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ ممبئی یونیورسٹی۔ انسٹیٹیوٹ آف پرشین ریسرچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انسٹیٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز، ممبئی۔ مولانا آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ٹونک، راجستھان اور شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں جو سیمینار ہوئے وہ وقت کی ضرورت، تحقیق کی جہت، طلبہ کے علم، اساتذہ کی فکر، شرکاء کے فہم کے اعتبار سے سبقت بردگر کے مصداق تھے۔

عہد وسطیٰ میں فارسی زبان کی سرکاری اہمیت کی وجہ سے بلاتفریق مذہب وملت جو مذہبی کارہائے نمایاں انجام دئے گئے ان میں سے بیشتر کی زبان بھی فارسی ہی رہی چاہے وہ مذہب اسلام ہو یا مذہب ہنود۔ اگر چہ ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت تھی مگر ان کے تمام مذہبی، اخلاقی، علمی، ادبی اور فکری ذخائر کی روح کو قلب فارسی میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس طرح فارسی زبان وادب کا دائرہ اپنے حدود سے تجاوز کر عربی، سنسکرت اور تاریخ کے ابواب تک پھیل گیا۔

ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش اسی ضمن میں ہے، کہ جن علوم وفنون پر فارسی زبان میں تالیف یا تراجم کے کام ہوئے ہیں ان کے متعلق تحقیقی مقالے شائع کئے جا سکیں تا کہ نت نئے تحقیق کے راستے ہموار ہو سکیں۔ لہٰذا تمام اساتذہ جو کہ مختلف زبان وادب سے تعلق رکھتے ہیں ان کی آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام ہی سرپرست حضرات کے مشورے سے اس ادبی ترجمان کو ذولسانی کیا گیا ہے۔

آپ کے مفید مشوروں اور ادبی تعاون کے ساتھ ساتھ آپ کی دعاؤں کا طالب!

مدیر

فردوسی طوسی اور اس کا آفاقی شاھکار شاھنامہ

عارف نوشاہی (ڈاکٹر)
ماڈرٹاون، ہمک، اسلام آباد، پاکستان

فارسی رزمیہ مثنوی شاہنامہ کے خالق ابوالقاسم فردوسی کی شہرت نہ صرف فارسی ادب کے آسمان کے روشن ستارے کی حیثیت سے ہے بلکہ ان کا شمار عالمی شہرت کے شعراء میں ہوتا ہے۔ انہیں فارسی رزمیہ شاعری کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے جس کی تقلید اب تک فارسی اور اردو رزمیہ شاعری میں ہوتی چلی آرہی ہے۔ فردوسی کے حالات زندگی کے سلسلے میں اس قدر افسانہ طرازیاں کی گئی ہیں کہ افسانوں اور حکایتوں کے درمیان سے ان کے صحیح اور اصل حالات زندگی تلاش کرنا دشوار ہے، اور تو اور ان کا اصل نام تک معلوم نہیں ہے۔ جو چیز ثابت ہے وہ ان کی کنیت ''ابولقاسم'' اور تخلص ''فردوسی'' ہے اور وہ اسی نام سے ادب کی تاریخ کے صفحات میں جاوداں ہیں۔

شاہنامہ کی اندرونی شہادتوں کی بنا پر فردوسی کے جو حالات متعین کیے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ان کی پیدائش تقریباً ۹۴۱ تا ۹۴۲ء میں ہوئی اور جب سلطان محمود غزنوی ۹۹۷ء میں تخت نشین ہوا تو فردوسی کی عمر ۵۸ سال تھی۔ ان کا تعلق صوبۂ خراسان کے قریہ طوس کے ایک دہقان خاندان سے تھا، اسی نسبت سے وہ ''فردوسی طوسی'' کہلاتے ہیں۔ طوس نام کی بستی تاریخ میں اپنے نام ور فرزندوں امام غزالی طوسی اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی وجہ سے بھی یاد رکھی جاتی ہے، لیکن اب یہ مشہد مقدس کے مضافات میں ایک طرح سے مشہد کا حصہ بن گئی ہے۔ فردوسی کی وفات ۱۰۲۰ء یا ۱۰۲۵ء میں ہوئی اور انہیں طوس ہی میں دفن کیا گیا۔ طوس (مشہد) میں فردوسی کا مقبرہ ایران کی قومی یادگار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے اور ہر ایرانی وہاں جانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ وہاں ایک شاندار باغ ہے اور زیر زمین مقبرے کی دیواروں پر سنگ تراشی کے ذریعے شاہنامے کی بعض داستانوں کے مناظر کو دکھایا گیا ہے۔ اب فردوسی کے مقبرے کے احاطے سے باہر ایک اور باغیچہ میں ''مقبرہ الشعراء'' بنا دیا گیا ہے جہاں خراسان کے نام ور شعرا کو دفن کیا جاتا ہے۔ اسی باغیچے کے ایک کونے میں جدید طرز کے معاصر فارسی شاعر مہدی اخوان ثالث کی قبر بھی ہے۔

فردوسی کا شاہکار شاہنامہ ان کی تیس سال محنت کا نتیجہ ہے، جیسا کہ وہ خود اشارہ کرتے ہیں:

بسی رنج بردم درین سال سی　　عجم زنده کردم بدین پارسی

یعنی میں نے ان تیس سالوں میں بہت تکلیف اٹھائی اور اس فارسی زبان کے ذریعے عجم (ایران) کو زندہ کیا۔ فردوسی کے اس قول میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے، کیوں کہ آج بھی ایران، فارسی، شاہنامہ اور فردوسی کے نام ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں اور اس ہیئت ترکیبی کو کسی طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ فردوسی نے شاہنامے میں ایرانی پہلوانوں اور بادشاہوں کی بہادری اور جوانمردی، میدان جنگ اور تن بتن لڑائیوں کی تصویر اس مہارت سے کھینچی ہے کہ آج بھی

قارئین انہیں پڑھ کر اپنے دل گرماتے ہیں۔شاہنامے کے دو کردار (پہلوان) رستم اور سہراب صلابت اور بہادری کی علامتی حیثیت کر چکے ہیں۔فردوسی کہتے ہیں کہ خدا نے آج تک رستم جیسا شہسوار (پہلوان) پیدا نہیں کیا۔

جہان آفرین تا جہان آفرید سواری چو رستم نیامد پدید

فردوسی نے شاہنامے کی نظموں میں اس چیز کا خاص خیال رکھا ہے کہ وطن دوستی اور ایران پرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جائے، یہی وجہ ہے کہ شاہنامے کو ایران کا سب سے بڑا رزمیہ کہا جاتا ہے۔فردوسی نے ہر رزمیہ داستان میں حکمت اور نصیحت کا اہتمام بھی کیا ہے۔بعض اشعار تو ضرب المثل بن چکے ہیں، جیسے:

توانا بود ہر کہ دانا بود زدانش دل پیر برنا بود

یعنی طاقت ور وہ ہے جو صاحب علم ہے، علم سے بوڑھا دل بھی جوان رہتا ہے۔

چنین گفت پیغمبر راست گوی ز گہوارہ تا گور دانش بجوی

یعنی صادق پیغمبر نے فرمایا کہ مہد سے لے کر لحد تک علم حاصل کرو۔

یہ سب کچھ فردوسی نے اس سہل، رواں اور سادہ انداز میں بیان کیا ہے کہ شاہنامے کی تصنیف کو آج ایک ہزار سال گذر جانے کے باوجود بھی اس کی زبان و بیان سب کے لیے قابل فہم ہے۔نیز اس کے تراجم دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

شاہنامہ اور پاکستان کے حوالے سے کئی دل چسپ باتیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔فردوسی نے شاہنامے میں سندھ اور سندھیوں کا ذکر کیا ہے اور یہ فارسی شاعری میں سندھ کا قدیم ترین حوالہ ہے۔

ہمان مادرم دخت مہراب بود بدو کشور سند شاداب بود

یا:

سر سندیان بود بنداد نام سواری سرافراز با رای و کام

۲۔برّصغیر میں شاہنامے کی پیروی میں جس قدر فارسی اور اردو مثنویاں لکھی گئی ہیں وہ کہیں اور نہیں لکھی گئیں۔اردو کی ایک شہرہ آفاق مثنوی سحر البیان (میر حسن) شاہنامے کی تقلید میں ہے۔اس سلسلے کی آخری کڑی ابوالاثر حفیظ جالندہری کا شاہنامۂ اسلام ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

۳۔شاہنامہ کا پاکستان کی قومی زبان اردو میں ترجمہ چھپ چکا ہے۔شاہنامے کی ایک نثری فارسی روایت تاریخ شمشیر خانی تصنیف توکل بیگ کا اردو ترجمہ لالہ مول چند منشی نے ۱۸۱۰ء میں قصہ خسروان عجم کے نام سے کیا۔اس کی ایک قدیم اشاعت کی دوبارہ عکسی اشاعت کا اہتمام ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد کی طرف سے شاہنامۂ فردوسی کی تکمیل کو ہزار سال مکمل ہونے پر کیا۔ایک اور اردو ترجمہ رجب علی بیگ سرور نے سرور سلطانی کے نام سے کیا۔

۴۔پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے نام ور استاد اور محقق حافظ محمود خان شیرانی (وفات: ۱۹۴۶ء) نے فردوسی اور شاہنامہ پر جس

قدر تحقیقی کام کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کے اردو مقالات کی چوتھی جلد (مرتبہ مظہر محمود شیرانی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء) میں فردوسی اور شاہنامے سے متعلق نو مقالات ہیں۔ ان مقالات کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کے دو الگ الگ فارسی ترجمے ہو چکے ہیں۔ پہلا ترجمہ افغان محقق عبدالحی حبیبی نے فارسی میں کیا جو ۱۹۷۷ء میں کابل سے ''چہار مقالہ بر فردوسی و شاہنامہ'' کے نام سے چھپا۔ دوسرا ترجمہ ایک پاکستانی استاد ڈاکٹر شاہد چوہدری نے کیا جو تہران سے ۱۹۹۲ء میں ''در شناخت فردوسی'' کے نام سے شایع ہوا۔

۵۔ حافظ محمود شیرانی کے فرزند اختر شیرانی (وفات ۱۹۴۸ء) جو اپنی اردو رومانوی شاعری کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں، انہوں نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۴ء کو فردوسی کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر ایک فارسی قصیدہ ''خطابۂ ارادت ارمغان بہ پیشگاہ جان پاک و روح اقدس تابناک استاد یگانہ و سخن گوی فرزانہ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی اعلی اللہ مقامہ در موقع جشن یادگار ہزار سالۂ فردوسی'' کے عنوان سے لکھا جو ان کے مجموعۂ کلام ''اخترستان'' میں کئی بار چھپ چکا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

ایا شاعر پاك ایران زمین
ز ما بر تو بادا ہزار آفرین

☆☆☆

خط کا سفر

محمد عقیل (ڈاکٹر)
شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

جب خدا نے انسان کی تخلیق کی تو اسے علم و دانش کا گراں قدر تحفہ عطا کر کے تمام مخلوقات پر برتری و تفوق سے سرفراز کیا۔ پھر اس دانائی و حکمت کے اظہار و بیان کے لیے بیان و قلم جیسا وسیلہ و ذریعہ عطا فرمایا تا کہ ابلاغ و ترسیل اور افہام و تفہیم کی راہ آسان ہو جائے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ سورۃ العلق میں ارشار فرماتا ہے۔ الّذی علّم بالقلم علّم الانسان مالم یعلم یعنی جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو ایسا علم سکھایا جو انسان جانتا نہ تھا۔ دوسری جگہ سورۃ رحمٰن میں بیان کے تعلق سے رب کائنات کا ارشاد ہے۔ خلق الانسان ۔ علّمہُ البیان یعنی اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔

ابتدائی دور میں انسان اپنے خیالات اور افکار کو زبانی اور شفوی طور پر پیش کیا کرتا تھا۔ جیسے جیسے انسانی تہذیب ترقی کے منازل طے کرتی گئی اسے اپنے تخیلات و تفکرات کو قلم بند کرنے کی جستجو اور تلاش ہوئی۔ انسان کو خدا نے ابتداء آفرینش سے ہی بیان و قلم کا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ انسان نے اس کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے حکمت و دانائی کی باتوں کو خطوں کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

یہ بات حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ خط کا ایجاد کس نے کیا اور کب کیا تھا؟ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے ہر تہذیب اور انسان کے ہر گروہ نے اپنے افکار و خیالات کو خطوں میں مقید کرنے کے لیے اپنے اپنے خط ایجاد کیے اور اسی خطوط میں اپنی حکمت و دانش مندی کی باتیں رقم کیں۔ جو آج تک اقوام عالم کے لیے مشعل راہ اور رہنمائی کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

خط لغت میں لکھنے کو کہتے ہیں۔ کتابت، تحریر، رقم سب کا ایک ہی معنی ہوتا ہے۔ اور اہل قلم اس شخص کو کہتے ہیں جو حروف کو ایسی شکل و صورت کا لباس پہنائے جس سے انسان کے پوشیدہ جذبات، احساسات و خیالات کی ترجمانی ہو۔ چونکہ یہ انسان کا کمال اور وجہ امتیاز ہے جو تخیلات کو مجسم و مصور بنا دیتا ہے۔ انہی خط سے لفظ وجود میں آتا ہے۔ چونکہ لفظ کی دلالت طبیعی ہے اور اس کا وسیلہ اور ذریعہ بھی طبیعی ہے۔ خط ایک کاریگری اور حرفت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان اور قلم دونوں ہی رہنمائی کے ذرائع ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس لیے قلم کا نام زبان بھی رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے الاقلام ، السنۃ الافہام یعنی قلم درک و فہم کی زبان ہے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے الخط لسان الید یعنی خط ہاتھ کی زبان ہے۔ دانشمندوں اور عقل مندوں نے قلم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''قلم ذکاوت کا چلمن ہے۔ اقلام کے آنسوؤں کی وجہ سے کتابیں خنداں

ہیں۔ بزرگوں کی عقلیں ان کے نوک قلم سے وابستہ ہوتی ہیں۔''

حافظ شیرازی نے کہا کہ ''خط ہاتھ کی زبان۔ دل کا ایلچی، اسرار و رموز کا مخزن، خبروں کا مرکز اور آثار قدیمہ کا محافظ ہوتا ہے۔''

عبدالحمید کاتب کا قلم کے بارے میں خیال اس طرح ہے:

''قلم وہ درخت ہے جس پر الفاظ کا میوہ لگتا ہے۔ فکر وہ دریا ہے جس کے موتی حکمت ہیں۔ تشنگان علوم و حکمت اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔''

قابوس بن وشمگیر کہتا ہے کہ: ''اگر آپ دبیر ہیں تو آپ کو قادر الکلام اور اچھا خطّاط ہونا چاہیے۔''

جعفر برمکی نے کہا تھا:

" الخط خيط الحكمته ينظم فيه منشور ها و يفضل فيه شذورها" ۔خط حکمت ایک ایسا دھاگا ہے جس میں حکمت کے موتی گوندھے جاتے ہیں اور اس کے زرّین اور سنہرے دانے نمایاں و ممتاز رہتے ہیں۔

ابن مقلہ کا قول ہے:

" الخط الحسن للفقير مال و للغنى جمال و للحكيم كمال" ۔خوبصورت خط غریب محتاج کی دولت ہے۔ مالدار کا حسن و جمال ہے اور حکیم و دانا کے لیے کمال ہے۔

خط کے بارے میں عربی کا شعر ہے:

تعلّم قوام الخط يا ذاالتأدب

فماالخط الا زينته المتأدب

ایسے استاد خط کے اصول و ضوابط کا علم حاصل کر کیونکہ فن خط ہی مہذب آدمی کے لیے زینت ہے۔

و ان كنت ذا مال فخطك زينته

و ان كنت محتاجا فاضل مكسبِ

اگر تو دولت مند ہے تو تیرے لیے باعث زینت ہے۔ اگر تو محتاج ہے تو یہ کمانے کا بہترین وسیلہ ہے۔

خط کے بارے میں دانش مندوں کے مذکورہ خیالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی و انسانی تہذیب کے نشو و نما میں اسی خط نے گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ اگر خط کا وجود نہ ہوتا تو انسانی تاریخ کے سنہری باب سے ہم ناواقف رہتے۔

ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے کہ سامی اقوام اپنی بستیوں میں جو زبانیں بولتی تھیں انہی کی ایک شاخ عربی زبان ہے۔ اس طرح عربی زبان کا آریائی یا حامی زبان سے کوئی تعلق نہیں۔

عربی زبان اپنی اصلی شکل میں کس طرح وجود میں آئی اس کا یقینی پتا لگانا بہت مشکل ہے۔ ماہرین اثار قدیمہ کے متعلق عربی زبان تین مختلف لہجوں میں بولی جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے لہجہ قریش غالب آ گیا۔ اسی لہجہ میں قرآن شریف کا نزول ہوا۔ جس طرح عربی زبان کے نشو و نما کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی اسی طرح عربی زبان کے رسم

الخط کے بارے میں ماہرین لسانیات کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکے ہیں۔

۶۰۰ ۳ قبل مسیح یا اس سے پہلے ایلام، سومیریا اور مصر میں ایک ایسا رسم الخط ایجاد ہوا جس میں دل کی بات تصویروں کے ذریعہ نقش و مصور کی جاتی تھی۔ اس رسم الخط کا نام ھیروغلیقی یا قدیم طرز تحریر تھا۔ اس رسم الخط کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پورے جملے کی ترجمانی ایک تصویر کرتی تھی۔

فینقی قوم جو ان دنوں بحر روم میں آباد تھی۔ مصر میں ایجاد شدہ حروف تہجی کو بحر روم کے شہروں میں پہنچایا۔ انہی شہروں میں قدیم قوم سامی، قوم آرامی بھی رہتی تھیں۔ جس نے اس رسم الخط کو ان کے ذریعہ سے سیکھا۔ فینقیوں کے رواج دیے ہوئے اس رسم الخط سے جس کا سلسلہ ھیروغلیقی سے جا ملتا ہے۔ بعد میں دو رسم الخط نکلے۔ ایک جنوبی عرب یعنی یمن میں جس کا نام خط مسند تھا۔ یہ خط قبل مسیح پورے جزیرۂ عرب میں استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا خط آرامی یا نبطی خط تھا۔ اس کا رواج شمالی عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کے واسطے سے ہوا۔ جو اس وقت بنی ارم کی زبان میں لکھتے تھے۔ بعد میں خط مسند کی کئی شاخیں ہو گئیں۔ چنانچہ جزیرۂ نمائے عرب کے شمالی حصے میں رسم خط صفوی، ثمودی اور لحیانی کا رواج رہا۔ اور جنوبی حصے میں حیری کا۔ عربوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنا حجازی رسم خط حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لیا ہے۔ اور انھوں نے نبطیوں اور کندیوں سے اور ان لوگوں نے خط مسند سے۔ اس طرح عربی رسم الخط کا سلسلہ مسند یعنی یمن میں رائج شدہ خط سے جا ملتا ہے۔

عرب مؤرخین کا خیال ہے کہ قبیلہ طے کے تین افراد نے عربی رسم الخط ایجاد کیا تھا۔ جن کا نام مرارہ بن مرّہ، اسلم بن سدرۃ اور عامر بن جدرۃ ہیں۔

عربی رسم الخط کا شجرہ اس طرح ہے:

ھیروغلیقی یا قدیم مصری طرز تحریر

فینقی

مسند		آرامی یا نبطی	
لحیانی	ثمودی	صفوی	حیری
		کندی و نبطی	
		حیری اور انباری	
		حجازی	
		کوفی	

علم الاقوام اور علم الالسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو اخلاق، عادات، اعتقادات، زبان، جسم اور دماغ کی مماثلت کے لحاظ سے تین مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) ایرین:۔ یورپ، ہندوستان، ایران۔

(۲) تورانی:۔ترکستان، چین منگولیا۔
(۳) سامی:۔عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

چونکہ سام کے بیٹے اور نوح کے پوتے کا نام آرام تھا جس کی جانب متعدد قبائل منسوب ہے (ان میں عاد، ثمود، نبطی اور سبائی وغیرہ) یہ سب قبائل سامی ہے۔جن کی زبان عربی سے قریب بتائی گئی ہے۔اور عربی زبان میں آرامی زبان کے بکثرت مادے داخل ہیں۔آرامی ایک زبردست قوم تھی۔جس کی زبان اور رسم الخط ذاتی تھا۔

خط سریانی جس کو خط تدمرّی سے ماخوذ مانا جاتا تھا۔جدید تحقیقات کے مطابق اس خط کو بھی آرامی سے ماخوذ مانا گیا ہے۔سریانی خط سے حیری خط بہت مشابہ ہے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ سریان میں عیسائی خاندان آباد ہوئے تو انھوں نے چاروں انجیل کو حفاظت کی غرض سے اسی خط میں منتقل کر دیا۔

مؤرخین عرب نبطی خط کے بارے میں اس بات پر متفق ہیں کہ اہل نبط حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ چونکہ حضرت اسمٰعیل کے لڑکوں میں سے بڑے لڑکے کا نام نابط یا نبط تھا۔اسی وجہ سے یہ لوگ نبطی کہلانے لگے۔اس بارے میں ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:

''تمام حجازی عرب اور مکہ کے مختلف قبائل کا نسب حضرت اسمٰعیل کے دو صاحبزادوں نابط اور قیدار پر ختم ہو جاتا ہے۔حضرت اسمٰعیل کے جانشین نابط ہو جاتے ہیں اور وہی تمام امور کے والی اور خانہ کعبہ کے متولی بن جاتے ہیں۔یہ بنی جرہم کے بھائی تھے۔بنی جرہم اس طرح مکہ پر مدّت دراز تک حکومت کی۔نابط کے پانچویں پشت میں مضاض نے مکہ پر دوبارہ حکومت کی اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضے سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مکہ کی حکومت چھین جانے کے بعد نبطی لوگ تقریباً ۸۵ قبل مسیح بذریعہ فوج کشی دمشق پر قبضہ کر لیا۔نبطی لوگ آرامی تہذیب سے بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے ایک جدید تہذیب اور تمدن کی بنیاد ڈالی۔نبطی لوگوں نے تجارتی لین دین کی غرض سے علم الکتابت کی ضرورت محسوس کی۔آخر کار آرامی خط اپنا لیا اور گفتگو کا لہجہ عربی برقرار رکھا۔ابتدائی آرامی خط غیر مہذب تھا۔انھوں نے اس خط کے سنوارنے میں بڑی کوشش کی اور حروف کی نئی شکلیں ایجاد کی۔اور اصلاح شدہ خط کا نام نبطی رکھا۔یہ خط آرامی خط سے مشابہ بھی تھا اور کچھ آرامی خط سے الگ بھی۔کتبہ قبر فہر، کتبہ قبر امرأ القیس، نقش حران اور نقش ام الجمادثانی۔یہ تمام نبطی خط میں تھے۔اسلام سے قبل چونکہ رسم الخط نے کافی ترقی کر لی تھی۔آخری کتبہ ام الجمال ثانی اسلام کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

ناجی زین الدین نے اپنی کتاب مصور الخط عربی میں لکھا ہے کہ اسلام سے قبل مکہ میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج تھا کیونکہ مکہ اس وقت تجارتی مرکز تھا۔مکہ میں اس وقت سترہ اشخاص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ان کے علاوہ سات عورتیں بھی کاتبہ تھیں۔

جب قرآن کا نزول ہوا تو کتابتِ وحی کے لیے کاتبوں کی ضرورت پیش آئی۔اس وقت قریش میں سولہ اشخاص

لکھنا جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اُبی بن کعب کے ذمہ کتابت وحی کا کام تھا۔ یہ پہلے کاتب ہیں جنھوں نے اپنے تحریر کے نیچے اپنا نام لکھنا شروع کیا۔ ان کے علاوہ زید بن حارثہ وحی کی کتابت کے لیے ہمیشہ ساتھ رہا کرتے تھے۔

علامہ ابن ندیم نے الفہرست میں محمد بن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ حجازی عرب کے اوّل رسم کتابت کا نام مکی ہے۔ اور دوسری کتابت کا نام مدنی ہے۔ یہ دونوں رسم خط اپنی نوع کے لحاظ سے تقریباً یکساں تھے۔ نبی ﷺ کے عہد کے اوراق وحی اور تبلیغی اور تبلیغی فرامین جو جزیرۃ العرب سے متصل حکمرانوں کے نام لکھوائے وہ سب چمڑے پر تھے۔ یہ خطوط ہرقل والی روم، کسری والی ایران، مُقوقس حاکم مصر اور نجاشی شاہ حبشی کے نام تھے۔

علامہ ندیم نے مزید لکھا ہے کہ میں نے مدینہ منوّرہ کے کتب خانوں میں حضرت علی بن ابی طالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویزات دیکھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نبی ﷺ کے کاتب کے کچھ خطوط بھی دیکھے ہیں۔ زمانہ رسالت میں چونکہ کاغذ نہ تھا اس لیے کتابت ہرن کی جھلّی، چمڑے کے ٹکڑے، شانہ کی ہڈیاں، پتھر کی پتلی تختیاں اور کھجور کی چوڑی پتیاں وغیرہ پر کی جاتی تھیں۔

تاریخی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ بشر بن عبدالملک کندی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مردوں میں فن کتابت حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ، حضرت ابوسفیانؓ بھی فن کتابت سے واقف تھے۔

خط کوفی کا رواج: ۱۷ھ مطابق ۶۳۸ء میں حضرت بن خطابؓ کے حکم سے حضرت سعد بن وقاص نے کوفہ کو فتح کر کے اسلامی مملکت میں داخل کر لیا۔ کوفہ کے چند میل کے فاصلے پر ایک قدیم ترقی یافتہ شہر حیرہ جہاں نعمان بن منذر کے عالی شان محلات بنے ہوئے تھے۔ حیرہ میں عیسائی اور سریانی خاندان آباد تھے۔ ان میں سریانی اور گرشونی (قریش کا رسم کتابت) کا عام رواج تھا۔ عربوں نے اس رسم کتابت کے ترقی یافتہ نمونوں کو دیکھا جو کوفہ اور حیرہ مروّج تھا۔ حجازی عربوں نے اپنی قدیم مکی، مدنی روش کے ساتھ ساتھ سریانی خط کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ایک جدید خط ایجاد کیا جو خط کوفی کے نام سے موسوم ہوا۔

حضرت انس کا بیان ہے کہ حضرت حذیفہ آرمنیہ اور آذربائیجان کے غزوات سے واپس ہو کر حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں میں قرأت قرآن کا بہت اختلاف ہے۔ قبل اس کے کہ لوگ یہود و نصارا کی طرح گمرہ ہوں آپ اس کی تلافی کا انتظام کریں۔ حضرت عثمانؓ حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ صحیفہ میرے پاس بھیج دیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں مدون ہوا تھا۔ تاکہ میں اس سے کچھ نقلیں تیار کراؤں پھر میں آپ کو واپس کر دوں گا۔ حارث بن ہشام کو اس خدمت کے لیے معمور فرمایا۔ انھوں نے عہد صدیقی کے جمع شدہ مصحف سے ایک دوسرا بڑا سائز کا مصحف تیار کیا۔ اس کی سورتوں کو طول و اختصار کی مناسبت سے ترتیب دیا۔ اور زبانوں سے لغت قریش پر قناعت کی۔ چونکہ قرآن کا نزول قریشی زبان میں ہوا تھا۔ پھر اس مصحف سے سات نسخے تیار کیے گئے اور انہیں مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ اور ایک نسخہ کو اپنے تلاوت کے لیے مدینہ منورہ روک لیا۔ جوام القرآن یا مصحف الامام کے نام سے موسوم ہے۔

دور بنوامیہ کا دارالسلطنت دمشق تھا۔ اس لیے شامی خط کا ظہور فطری عمل تھا۔ ابو حیان نے خط کوفی کے مختلف اقسام کا ذکر اپنی کتاب رسالۃ الکتابت میں کیا ہے۔ جب اسلامی تہذیب نے کوفہ اور شام میں ترقی کے مدارج طے کر لیے تو خطاطی ایک باقاعدہ ایک فن بن گیا۔ ماہرین فن کتابت نے خط کے قواعد اور ضوابط ایجاد کیے اور عربی خط کی کتابت کو اچھا اور عمدہ بنانے کے لیے مختلف اسلوب اختیار کیے۔ انھوں نے مختلف شکلوں میں اور متعدد ترکیبوں سے حسن ایسا جامع پہنایا جو مردوں کو زندہ کر دے اور لوگوں میں جادو جیسی لہر دوڑا دے۔

خط طومار:۔ خط طومار کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں دو اقوال ہیں۔ پہلی رائے جس کے بارے میں صاحب نہاج الاصابہ نے وزیر ابن مقلہ سے نقل کیا ہے کہ خط کوفی کے چودہ طریقوں میں سے دو طریقے اہم ہے۔ ان میں پہلا طریقہ خط طومار کا ہے۔ جب کوئی شامی فرمان لکھنا ہوتا تھا تو پوست آہو یا چمڑے کو بڑے تختہ چوب پر بچھا کر لکھا کرتے تھے۔ مدینہ منورا کے قدیم مصاحف کی کتابت خط طومار میں کی جاتی تھی۔

غبار الحلیہ:۔ اس خط کی کتابت پورے طور پر مدوّر ہوتی تھی۔ اور کوئی حرف سیدھا نہیں لکھا تھا۔ دور بنوامیہ میں مصاحف کی کتابت ان چند خطوط میں کی جاتی تھی۔ جیسے المکی، المدنی، المثلث، الکوفی، بصری، مصنوع، مائل، راصف، اصفہانی وغیرہ۔

عربی خطوط میں جو مقام خط کوفی کو حاصل ہوا۔ یہ درجہ کسی اور اسلامی خط کو نہیں ملا۔ اس کی کئی وجہ بیان کی گئی ہے۔ ان سب میں پہلے خط کوفی جو وجہ فضیلت حاصل ہوئی وہ قرآن کی کتابت کی وجہ سے ہوئی۔ خط کوفی کے ابتدائی شکلوں کے پیش نظر ماہرین کتابت نے اس کے ستّر فروعات ایجاد کیے۔ اور کمال یہ ہے کہ ہر شکل کا الگ الگ نام معنی اور مفہوم ہے۔ عباسی خلیفہ ہارون رشید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ شاہانِ عجم مجھ سے فخر و مباہات کی باتیں کریں تو ان کے مقابلے میں سدا بہار خط کوفی کو پیش کر دوں گا۔ جو ہر جگہ پایا جاتا اور ہر زبان میں لکھا جاتا۔

خط کوفی میں جس نے کمال پیدا کیا اس میں سب سے مشہور نام وزیر ابوعلی ابن مقلہ کا ہے۔ اس فخر روزگار خطاط کا نام ہے ابوعلی ملقب بہ ابن مقلہ تھا۔ اس کی ولادت ۲۷۲ھ میں ہوئی۔ تعلیم کے تکمیل کے بعد وہ عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہ وار پر منشی ہو گیا۔ ابن مقلہ نے خط کوفی کی رائج شدہ فروعات میں اصلاح کر کے اس کو حسین تر بنانے میں بے مثال کامیابی حاصل کی۔ اسی فنی کمال نے اسے خلیفہ کے دربار تک پہنچا دیا۔ اور اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین عباسی بادشاہوں کا وزیر رہا۔ مقتدر باللہ، قاہر باللہ اور راضی باللہ ان تینوں کے دربار سے منسلک رہا۔ چونکہ راضی باللہ کو ختم کرنے کی سازش میں اس کا بھی ہاتھ تھا اس لیے جب راز افشاء ہوا تو راضی باللہ نے اس کا گھر جلوا دیا اور ہاتھ کاٹ دیا۔ ابن مقلہ نے بقیہ زندگی قید میں گزاری اور یہ ماہر فن چھپن سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ ابن مقلہ کی وفات کے چوراسی سال بعد ابوالحسن علی بن ہلال معروف ابن بواب پیدا ہوا۔ جس نے خط کوفی میں کمال پیدا کیا۔ دراصل ابن بواب ابن مقلہ کا معنوی شاگرد تھا۔ ابن بواب نے ابن مقلہ کے خطوط میں آراستگی، خوبصورتی اور حسن نکھار پیدا کر کے قبولیت عامہ کی سند حاصل کی۔

تیسرا بڑا نام یاقوت المستعصمی کا ہے۔ جو مستعصم باللہ کا غلام تھا۔ نسل کے اعتبار سے رومی تھا۔ عثمانی ترکوں نے اس کی بے مثال خطاطی کی وجہ سے قبلہ خطاطین کا لقب دیا تھا۔ اس نے بالواسطہ خطاطی ابن بواب سے سیکھی تھی۔ اور عرصۂ دراز تک ابن بواب کے کتبات کی نقل کرتا رہا۔ اور خط کی دنیا کا شہسوار مانا جانے لگا۔ خاص کر خط ثلث نے اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

خط نسخ:۔ خط نسخ کب ظہور میں آیا اور اس کا موجد کون تھا۔ مؤرخین اس بارے میں خاموش ہیں۔ بعض ماہرین رسم کتابت کا خیال ہے کہ نقش حرّان نقش ام الجمال ثانی کی ترقی یافتہ ہے۔ جو ابتدا میں خط مکی اور مدنی کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ اسی رسم کتابت کا ایک نمونہ ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے حضرت ماویہ کے عہد کی ایک دیوار پر کندہ دیکھا تھا۔ یہی خط دوسرے خطوط کی آمیزش سے ایک خاص شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ ماہرین نے اس کا نام قلم النساخ رکھا۔ اس جدید خط کے منظر عام پر آنے کے بعد دوسرے رائج خط رفتہ رفتہ ناپید ہوتے گئے۔ قلم النساخ دھیرے دھیرے ترقی کرتا گیا۔ یہ خط وزیر ابن مقلہ کے ہاتھوں عہد طفولیت سے نوجوانی منزل طے کرتا رہا۔ اس کے بعد ابن بواب اور یاقوت مستعصمی نے اس میں چار چاند لگا دیے۔ ماہرین کا بیان ہے کہ اس خط کا نام خط نسخ اس لیے تجویز ہوا کہ قرآن قریم کی کتابت کے ساتھ ساتھ مصنفین نے اپنی اپنی کتابیں بھی اس رسم خط میں کتابت کرنا پسند کیں۔ اور دوسرے خطوط کو منسوخ کر دیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ خط نسخ کو اتابکہ کے زمانے میں بے حد ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ یہ خط اتابکی کے نام سے جانا جانے لگا۔ دور ایوبی میں مصر اور شام میں خط ثلث اور نسخ نے عروج کامل حاصل کیا۔ انہی ایام میں ایک ایسے خط کا ظہور ہوا جو ثلث اور نسخ کے امتزاج سے تخلیق ہوا تھا۔ یہ ملا جلا خط عالم اسلام کے مشرقی خط میں رائج ہوا۔

خط ثلث:۔ خط ثلث کے بارے میں بعض ماہرین نے لکھا ہے کہ اس خط کا موجد وزیر ابن مقلہ ہے۔ لیکن الفہرست ابن ندیم سے پتا چلتا ہے کہ دور بنی امیہ میں مصاحف کی کتابت المثلث میں خط میں بھی کی گئی۔ دوسری تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ ابن مقلہ سے قبل قلم الثلثین میں مصاحف کی کتابت کی جاتی تھی۔ اور اس خط کا موجد ابراھیم الشجر ی تھا۔ مامون رشید کے عہد کا نامور خطاط احول محرر المثلث اور الثلثین ابراھیم الشجر ی سے سیکھا تھا۔ ان خطوط میں معمولی سے اصلاح کر کے خفیف الثلث ایجاد کیا تھا۔ خط ثلث دور عباسی سے عصر حاضر تک اتنا ہی مقبول تھا جتنا روز اوّل میں تھا۔

خط تعلیق:۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں حسن بن علی فارسی جو عماد الدولہ دیلمی کے کاتب تھا۔ توقیع اور رقاع کی آمیزش سے ایک نیا خط ایجاد کیا۔ جس کا نام تعلیق رکھا۔ یہ خط فارسی دفاتر کے لیے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوا۔ جہاں جہاں فارسی زبان میں دفاتر قائم کیے گئے وہاں وہاں اس خط نے قبولیت عامہ کی سند حاصل کر لی۔

نستعلیق:۔ دراصل یہ دو خط نسخ اور تعلیق کے اتصال سے وجود میں آیا۔ اس لیے استاذ فن نے اس مخفف اور مختصر نام تعلیق رکھا۔ نستعلیق کے موجد میر علی تبریزی مشہور ہیں۔ یہ امیر تیمور کے عہد کا نامور خطاط تھا۔ جو فن کے اعتبار سے عدیم النظیر مانا گیا ہے۔ ابو الفضل مرقع بادشاہی کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیق کی وصلیاں دیکھی ہیں۔ لہٰذا میر علی تبریزی نستعلیق کے موجد نہیں ہو سکتے۔ ابو الفضل کے خیال کو بعض ماہرین نے صحیح مانا ہے۔

اس کے باوجود نستعلیق کے موجد کی حیثیت سے میر علی تبریزی کا نام ہی معتبر مانا جاتا ہے۔

خط طغری:۔ عثمانی ترکوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ایک خصوصی انداز سے لکھنا شروع کیا۔ یعنی بسم اللہ کے حروف کو ایک خصوصی شکل دیا۔ اس شکل کو طغری کے نام سے موسوم کیا۔ اس علامت بسم اللہ کو انھوں نے اپنا قومی شعار بنالیا۔ اور اعتقادی طور پر خیر و برکت کا سرچشمہ بھی سمجھا۔ افشل پاشا کے بقول طغری ہمایوں یا ہما کا ہم مثل ہے۔ جس کو عرب طیر السعد کہتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ہما نامی پرندہ اگر کسی کے سر پر سایہ ڈال دے تو وہ لازمی طور پر کبھی نہ کبھی بادشاہ بن جائگا۔

خط شکستہ و شفیعہ :۔ ایرانی قلموں میں نستعلیق اگر چہ سب سے خوبصورت خط مانا جاتا ہے مگر دیر میں لکھا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی دو شاخیں ہوگئیں۔ ایک خط شکستہ اور دوسر شفیعہ۔ تقریباً ۱۱۰۰ھ میں مرتضیٰ کلی شام لو حاکم ہرات نے خط شکستہ وضع کیا جو روز مرّہ اور دفتر کا خط تھا۔ اس سلسلے میں مرتضیٰ کلی کے میر منشی شفیعہ نے شکستہ میں ایک خاص حسن پیدا کر کے اس کا نام شفیعہ رکھا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ خط ریحان، خط معکوس، خط تعمیہ، خط غبار یا قلم الجناح وغیرہ کا بھی رواج رہا۔

☆☆☆

تذکرہ نکات شعراء: ایک جائزہ

رعنا خورشید (ڈاکٹر)
شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

میر تقی میرؔ اردو و فارسی ادب کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جن کے ادبی کارنامے اہمیت کے حامل ہیں۔ میرؔ کے شعری آثار ہوں یا نثری ان میں میرؔ کی شخصیت مکمل طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ شعری آثار میں ان کے چھ دیوان، ایک فارسی دیوان کے ساتھ مثنویاں شامل ہیں۔ نثری کارناموں میں تذکرہ نکات الشعراء فارسی رسالہ اور فیض میر کے نام قابل ذکر ہیں۔ 'نکات الشعراء' پر تبصرہ کرنے سے قبل اس دور کے اوضاع سیاسی وسماجی، معاشی ومعاشرتی کا جائزہ لینا لازمی قرار پاتا ہے۔ کیونکہ ہر ادب اپنے اردگرد کے ماحول کا نہ صرف عکّاس ہوتا ہے بلکہ داخلی وخارجی احوال سے درجہ تک اثر قبول کرتا ہے۔ جس سے متاثر ہوکر کسی بھی ادب پارے کی تخلیق وجود میں آتی ہے۔

میر تقی میرؔ نے جس وقت آنکھیں کھولیں، ہندوستان کی سیاسی فضا بڑی گوناگوں تھی۔ نادرشاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) بربریت، خونریزی، لوٹ مار کسی چنگیزی قیامت سے کم نہیں تھا۔ قتل عام اور خون آشامی کا یہ حال تھا کہ سڑکوں پر لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ قلعہ میں رہنے والی بیگمات فاقہ کشی، غیرت اور اذیت کو برداشت نہ کرسکیں اور دریائے جمنا میں کود کر اپنی جان گنوانے پر مجبور ہوگئیں۔ عوام خس وخاشاک سے زیادہ بے حیثیت، مجبور اور بے دست و پا ہوکر رہ گئی تھی۔ معاشی گراوٹ کے ساتھ اخلاقی گراوٹ سماج کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ امراء واعیان دولت کی عیش وعشرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ غرض ہر چھوٹا بڑا اقتصادی ومالی کمزوریوں میں گرفتار تھا۔ اجارہ داری کی لعنت نے آسائش واطمینان خاطر کو سلب کردیا تھا۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں میر تقی میرؔ نے آنکھیں کھولیں۔ ایک طرف ملک کے بگڑتے احوال دوسری طرف کم عمری میں والد اور چچا کی سرپرستی سے محرومی، سوتیلے بھائیوں اور ماموں کی دی ہوئی اذیتیں، کم عمری میں بے یارومددگار اور کس مپرسی نے ان کے اندر درد، سوز وگداز، صبر وتحمل، خودداری اور وضع داری پیدا کردی۔

میرؔ سے جہاں تک ہوسکا دلّی میں قیام پذیر رہے لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو نواب آصف الدولہ کی دعوت پر دلّی کو خیرآباد کہہ کر لکھنؤ کی جانب ہجرت کی۔

خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

''یہ ہجرت ان کے لیے معمولی واقعہ نہیں، ایک تہذیبی سانحہ اور نفسیاتی حادثہ تھی'' [۱]

لکھنؤ آکر بھی میرؔ کو اطمینان قلب وذہنی سکون میسر نہ ہوا۔ ان کے دوران باطن میں کشمکش بدستور قائم رہی۔ یہ تبدیلی ماحول ان کے مزاج اور فطرت کے موافق نہ تھا۔ وہ خرابہ دلی کو جنت نشان لکھنؤ سے بہتر تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سرا سیمہ نہ آتا یاں

مذکورہ بالا تمام اوضاع سیاسی، معاشرتی اور معاشی تھے جس کی وجہ سے میرؔ کی زندگی تلخ حقائق سے برسرکار رہی۔ ان کے یہاں کشمکش، تشنگی اور بے چینی زندگی کا احساس خواہ نظم ہو یا نثر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ میرؔ نے جس طرح اردو شاعری میں اپنی طبع فکر کے گوناں گوں گل کھلائے ہیں اسی طرح ان کی نثر بھی ان کے بوستان فکر سے خوشبودار اور معطر ہے۔

میرؔ کے نثری آثار میں 'ذکر میرؔ' ہے جو ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ دوسرا نثری آثار 'رسالۂ فیض میرؔ' ہے جس میں انہوں نے بزرگوں کے حالات و کرامات کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ ان بزرگوں کی طرف ان کی عقیدت مندی، فقیر منشی اور درویش صفتی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

''تذکرہ نکات الشعراء'' تنقید کی تاریخ میں اس رسالہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ تذکرہ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ کے عہد میں لکھا گیا۔ باوجود اختصار کے قابل اہم اطلاعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے میرؔ کی اہم ترین تصانیف میں اسکا شمار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر ادب اپنی تہذیبی اور تاریخی اقدار سے الگ نہیں رہ سکتا، لہذا ہر شعبہ کا اثر کسی نہ کسی انداز میں ادب کو ضرور متاثر کرتا ہے۔ لہٰذا میر تقی میرؔ کا ''تذکرہ نکات الشعراء'' بھی اپنے زمانے کے عمومی رجحانات کا پابند نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرؔ نے شعر و ادب کی مروجہ روایات سے آزاد ہو کر ان کو تنقیدی نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔ ''تذکرہ نکات الشعراء'' ایک پر ارزش تذکرہ ہے جسے اردو تنقید کی تاریخ میں اولیت درجہ کی اہمیت حاصل ہے جس کا اعتراف میرؔ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئ معلی شاہ جہان آباد کتابی تا حال تصنیف نشدہ کہ احوال شاعران این فن بہ صفحۂ روزگار بماندہ'' ۲؎

میرؔ کا یہ اعتراف حق بجانب نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ مخزن نکات مولفہ قائم تذکرہ ریختہ گویان مولفہ گردیزی اور گلشن گفتار مولفہ حمید اورنگ آبادی کی تکمیل 'تذکرہ نکات الشعراء' کے بعد کی ہے۔ میر جس وقت اس تذکرہ کو سپرد قلم کر رہے تھے ان کے سامنے اردو تذکرہ کی کوئی مثال نہیں تھی۔ حالانکہ فارسی میں سدید الدین عوفی کا تذکرہ لباب الالباب کی شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ 'تذکرہ نکات الشعراء' معترضین اور ناقدین کے اعتراضات اور تنقید کا نشانہ بنا رہا۔ ان کی تنقید کو عیب چینی، ہنر پوشی اور خردہ گیری سب ہی کچھ کہا گیا۔

خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

''ان معترضین میں خاص طور پر قابل ذکر فتح علی گردیزی (صاحب تذکرۂ ریختہ گویان) میر محمد یار عرف کلن (تذکرہ خاکسار کے مصنف) حکیم قدرت اللہ قاسم (صاحب مجموعہ نغز) شفیق اورنگ آبادی (صاحب چمنستان شعرا) مولوی کریم الدین (صاحب طبقات الشعراء) اور مولانا آزاد (صاحب آب حیات) ہیں۔'' ۳؎

'تذکرہ نکات الشعراء' میں میرؔ کی شخصیت و سیرت پورے طور پر نمایاں ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کی رائے ہے:

''میرؔ میں تنقیدی قوت تو بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کا اظہار بھی وہ بڑی بے باکی اور بے دردی سے کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے لب ولہجہ میں تلخی اور ترشی ہے اور اس نے ہمدردی کے اس عنصر کو نقصان پہنچایا ہے جو اچھی تنقید کا لازمی جز ہے۔'' ۴

''تذکرہ نکات الشعراء' میں میرؔ کی جرأت مندانہ اور بے باک فطرت نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی وہ لعن وطعن میں حد سے تجاوز کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً انعام اللہ خان یقین پر لعن وطعن کی انتہا ہی کر دی مثلاً کم فہم، سارق اور یہاں تک کہ شاعرانہ ذوق پر مہر ناشناسی لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد'' وغیرہ۔ اسی طرح میر علی حشمت کو ''مردے ہنگامہ باز'' اور محمد قاسم کو ''جوانی است خیرہ طیرہ، حسن پرست نوکر یشہ۔ اسی طرح محمد یار خاکسار کو بڑے تلخ اور زہریلے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

میرؔ کسی شاعر کی نکتہ چینی کرتے وقت جو اس کی تصویر مرتب کرتے ہیں اس سے ان کے لب ولہجہ کی تلخی پورے طور پر واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کسی شاعر کے اندر صفات کو ڈھونڈتے ہیں تو ان کو بیان کرنے میں کسی طرح کا گریز نہیں کرتے۔ فراخ دلی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ مثلاً خواجہ میر درد کو جوش بہار گلستان، سخن عندلیب، خوش خوان، متواضع اور خلیق وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ (کلمات الشعراء سلیمان کلکشن نسخۂ خطی، ۲۹)

لالہ ٹیک چندر بہادر کے لیے بیان کرتے ہیں:

'مردی چست و مستعد و برہمن رنگین بودہ'

مصطفیٰ خان یک رنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

'بسیار چسپان اختلاط و آشنائی درست بود' ۵

مرزا محمد رفیع سودا کے متعلق لکھتے ہیں:

'بسیار خوش خلق و خوش خوی، گرم جوش، یار باش شگفتہ روی، خوش بہار گلستان، سخن عندلیب وغیرہ' ۶

قزلباش خان امید کے بارے میں لکھتے ہیں:

'شاعر خوب فارسی، نکتہ پرداز، بذلۂ سنج، جوان دل، عزیز دلہا، خوش اختلاط ہمیشہ خندان و شگفتہ رو' ۷

میر عبدالحی تاباں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

'بسیار خوش فکر، خوبصورت، خوش خلق، پاکیزہ سیرت وغیرہ' ۸

تاباں کی شاعرانہ خصوصیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی زبان میں رنگینی اور پاکیزگی گلاب کی پنکھڑی سے بڑھ کر تھی وغیرہ۔ مذکورہ مثالوں سے ان کے مزاج کی درشتی کے ساتھ بیانات کی شکستگی بھی نظر آتی ہے۔ جس سے ان کی بے باکی اور دلیری کے ساتھ وسعت قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں تک میرؔ کی اسلوب نگارش کا تعلق ہے تو میرؔ کو فارسی

زبان سے بہت لگاؤ و رغبت تھی۔ میرؔ کی فارسی عبارت صاف اور شگفتہ ہے، سادہ اور روان ہے۔ جملوں میں برجستگی اور ساختگی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ میرؔ کی نثر کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ عبارت گرچہ مقفع لکھتے ہیں قافیوں کی پابندی میں الجھ کر نہیں رہ جاتے۔ مثلاً توصیفی جملے خوب لکھتے ہیں:

جیسا کہ قبلاً تذکرہ کیا گیا ہے کہ میرؔ کے یہاں فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ میرؔ خود فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کے متعلق تذکرہ نکات الشعراء میں لکھتے ہیں:

"سیوم آنکہ حرف و فعل پارسی بکار برندو این قبیح است۔ چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند، اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آن جائز است، و این را غیر شاعر نمی داند، و ترکیبی کہ ناموس ریختہ می باشد آن معیوب است... اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوی ریختہ جود مضائقہ ندارد" ۹

میر حسن نے "تذکرہ میر حسن" میں میرؔ کے متعلق اپنی رائے اسطرح دی ہے:

"چراغ نثرش روشن و ساخت نظمش گلشن" ۱۰

مختصر یہ کہ میرؔ کی تنقید کی زبان صاف اور بے باکانہ ہے۔ یہ ان کی اہم خوبی ہے۔ مختصر الفاظ میں زیر بحث شاعر کی خوبی یا خامی بڑی مہارت اور چابکدستی سے تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ جس سے میرؔ کی پسند اور ناپسند دونوں پہلو خواننده کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

"نکات الشعراء، میں اسکی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ انکی تنقید تخریبی ہی نہیں، تعمیری بھی ہے۔ انھوں نے اگر ایک کعبہ گرایا ہے تو دوسرا بنایا بھی ہے۔ یہ جرأت ان کی عظیم الشان شخصیت کو ظاہر کرتی ہے۔" ۱۱

حوالہ جات:

۱۔ میر تقی میرؔ حیات اور شاعری، خواجہ احمد فاروقی، ص ۳۴۔
۲۔ تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میرؔ، ص ۵۱۔
۳۔ میر تقی میرؔ حیات اور شاعری، خواجہ احمد فاروقی، ص ۵۳۱۔
۴۔ ایضاً، ص ۵۲۳۔
۵۔ تذکرہ نکات الشعراء، میر تقی میرؔ۔ ص ۳۵۔
۶۔ ایضاً، ص ۲۷۔
۷۔ ایضاً، ص ۷۔
۸۔ ایضاً، ص ۸۔

۹۔ انتخاب ذکر میر، بحوالہ علی گڑھ میگزین، ص ۳۰۷۔
۱۰۔ تذکرہ میر حسن، میر حسن، ص ۱۷۵۔
۱۱۔ میر تقی میر حیات اور شاعری، خواجہ احمد فاروقی، ص ۵۳۱۔

کتابیات:

۱۔ آب حیات، محمد حسین آزاد۔
۲۔ ہندوستان پر مغلیہ حکومت، مفتی شوکت علی فہمی۔
۳۔ دیوان میر (اردو)، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری۔
۴۔ ذکر میر، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق،
۵۔ تذکرہ نکات الشعراء، مرتبہ حمیدہ خاتون۔
۶۔ نکات الشعراء (قلمی نسخہ)، میر تقی میر، سلیمان کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی۔

☆☆☆

شاعرِ مست الست : رضوان سعید

عالم اعظمی (ڈاکٹر)
شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

''۱۹ویں صدی کے معروف انگریزی شاعر کیٹس (Keats) نے کہا تھا کہ اچھی شاعری کو اتنے ہی فطری طور پر وجود میں آنا چاہئے جیسے درختوں کی شاخوں پر پتیاں۔ ناموافق حالات اور پڑھنے لکھنے کے مواقع کی یکسر کمی کے باوجود شاعری کی کونپلیں رضوان سعید کے وجود سے بھی ایسے ہی پھوٹتی رہی ہیں گو کہ کسی روایتی نظر کے لئے اس کی شناخت وتحقیق دشوار ہے'' (پروفیسر سید خالد قادری)

''رضوان سعید کے یہاں سرمستی بھی ہے اور بے کیفی بھی، درد کی چیخ بھی ہے اور قہقہوں کے پس پشت گرد ملال بھی۔ ان تمام کیفیات کو انھوں نے اپنے اشعار میں سمو کر ایک ایسی کسک پیدا کر دی جو قاری کو اسیر کرے.....رضوان سعید نے نئی تشبیہات، استعاروں اور علامتوں سے اپنے اشعار کی تزئین کی ہے۔ ان کا درویشانہ آہنگ اور صوفیوں سنتوں کا سا انداز متاثر کن اور عام ڈگر سے ہٹ کر ہونے کی وجہ سے قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہے''

(پروفیسر رحمت یوسف زئی)

پروفیسر سید خالد قادری اور پروفیسر رحمت یوسف زئی کی مذکورہ قیمتی آرا رضوان سعید کی زندہ وارزندہ فکری وفنی تفصیل کا بہترین اجمالی تعارف ہیں اور رضوان سعید کی شاعری کا غالب حصہ مذکورہ بالا تنقید کے آئینے میں عکس بار ہے۔ کیٹس نے اچھی شاعری کے وجود کو شاخوں کی پتیوں کی فطری نمود سے تشبیہ دی ہے اور اقبالؔ نے تخلیقی عمل کو سیکس کے ٹینشن اور دردِ زہ سے تعبیر کیا ہے۔ سیکس کے ٹینشن کی مثال وہ شاعری ہے جو بقول غالبؔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

کے تحت وجود میں آتی ہے اور دردِ زہ کی مثال وہ تخلیقی عمل ہے جس کی طرف میرؔ نے اشارہ کیا ہے ؎

مصرع کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں کس خود سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

ہر اچھے شاعر کی طرح رضوانؔ سعید نے بھی یہ تخلیقی عرفان حاصل کر لیا ہے کہ معجزۂ فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے لہذا وہ کسی فکر کو اس وقت تک شعر کے قالب میں نہیں ڈھالتے جب تک وہ جذبے کی آنچ میں تپ کر کندن نہ ہو جائے۔ بے پناہ تخلیقی قوت اور برسہا برس کی فنی ریاضت نے ان کے قلم میں شرر تیشہ کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور ان کا غم خانہ خانۂ فرہاد کی طرح روشن ہو گیا ہے۔ رضوانؔ سعید نے فکر وفن کے کیسے کیسے گہر ہائے آبدار زیب خامہ وزینت قرطاس کئے ہیں، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

☆ اور اک نام کی طلب کیوں ہے میں تو قاتل کا نام لے بھی چکا

☆ میرے چہار سمت ہیں نادیدہ آہٹیں — تنہا چلا ہوں یا کہ کوئی قافلہ ہوں میں
☆ زباں زباں پڑھے ہوئے سبق سبق ورق ورق — دکھا رہے ہیں بام و در کتابِ دل کھلی ہوئی
☆ یہ ٹوٹتا ہوا بدن پناہ مانگتی گھٹن — یہ کس کے انتظار میں ہے زندگی رکی ہوئی
☆ میں چاہتا ہوں مرے ہجر میں زمیں تڑپے — نچڑ کے غم سے مرے زرد آسماں ہوجائے
☆ خبر کسے تری آنکھوں سے میری آنکھوں تک — بچھیں جو اشک تو اک اور کہکشاں ہوجائے

ایک محضرمی شاعر کعب ابن زہیر کا شعر ہے ۔

ما أرانا نقول الا معاراً — او معاراً من قولنا مکزوراً

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو مستعار لے کر کہتے ہیں یا اپنی ہی بات کو دہراتے ہیں)

کعب ابن زہیر نے یہ بات تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے کہی تھی جب دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل نہیں ہوئی تھی اور آج کی طرح آمد و رفت اور مواصلاتی نظام کی برق رفتار اور روز افزوں ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اگر اس زمانے میں فکری اشتراک سے گریز محال تھا تو آج مختلف شعراء کے کلام میں تکرار و توارد پر مبنی اشعار کی موجودگی ایک فطری امر ہے۔ یوں بھی فطرت انسانی کی یکسانیت کے باعث ایک اعلیٰ وارفع خیال مختلف زمان و مکان کے مفکرین پر ملہم ہوسکتا ہے جبکہ طرز ادا کی جدت اور اظہار کی ندرت ان میں انفرادی شان پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً غمِ جاناں سے غمِ دوراں کا علاج کرنا ہمارے اکثر شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اصغؔر کے خاص رنگ میں اس موضوع کو ملاحظہ فرمائیے ۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اسی خیال کو فانیؔ نے کس اچھوتے لہجے میں نظم کیا ہے ۔

جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی — ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

اصغؔر اور فانیؔ کے کلاسیکل رنگ کو رضوانؔ سعید کے نیو کلاسیکل لہجے میں ملاحظہ فرمائیے ۔

غمِ جاناں کو میں نے دل کی رنگیں شہریت دے دی — غمِ دوراں کچھ اک دکھڑے سنا کر لوٹ جائیں گے

خواجہ دردؔ کا مشہور شعر ہے ۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

رضوانؔ سعید نے بھی اس مضمون پر مشتمل اپنے مخصوص لہجے کا کامیابی کے ساتھ تحفظ کیا ہے ۔

گرائیں گے کہاں رضواںؔ ہم اپنے معتبر آنسو — اگر وہ پارسا دامن بچا کے لوٹ جائیں گے

ڈاکٹر نسیم نکہتؔ لکھنوی کا شعر ہے ۔

ہمارے ذہن بھی نکہتؔ بہت شکستہ ہیں — حویلیوں کی ٹپکتی ہوئی چھتوں جیسے

اس مضمون کو تقریباً انھیں لفظیات کے ساتھ نیا بلکہ منفرد پیراہن عطا کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن رضوانؔ سعید آخر رضوانؔ سعید ہیں جو سنگ تراشی ہی نہیں آہن گدازی کا بھی ہنر جانتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے کس سلیقے سے اپنے منفرد رنگ کا

تحفظ کرتے ہوئے اس خیال کو شعری زبان دی ہے ۔

بارشیں چھید گئیں ذہن کی سنگین چھتیں　　آ گئے اشک فراموشیوں سے چھن چھن کے

محبوب کا وعدہ اور عاشق کی توبہ دونوں غیر معتبر ہوتے ہیں اور دونوں کو ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی ۔ چنانچہ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

خمارِ ما و درِ تو بہ و دلِ ساقی　　بہ یک تبسمِ مینا شکست و بست و کشاد

ماہر القادری کہتے ہیں ۔

یہ بھی کیا ترکِ تعلق ہے الٰہی توبہ　　پھر اسی دشمنِ ایماں کا خیال آتا ہے

خمار بارہ بنکوی اپنے مخصوص لب و لہجہ میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ۔

چلا تو ہوں کوچے سے ان کے بگڑ کر　　ہنسی آ رہی ہے کہ آنا پڑے گا

رضوان سعید اس شعری روایت کے پاسدار بھی ہیں اور امین بھی ۔ لہذا کہتے ہیں ۔

حشر توبہ کا کیا ہوا رضوان　　آج بھی ان سے آشنائی ہے

انسان کی شخصیت خصوصاً ایک شاعر کی شخصیت اور وہ بھی اس حساس شاعر کی شخصیت جو تا حیات محض رہ نوردِ تجسس رہا ہو اور منزل آشنا نہ ہوا ہو، کئی ذیلی، ضمنی اور جزوی شخصیات کا مرکب ہوتی ہے ۔ ہر جزوی شخصیت زندگی کے مختلف مراحل میں بہت سے ایسے احوال و واقعات اور خیالات و نظریات سے وابستہ ہو جاتی ہے جو کبھی کبھی ایسے خواب میں تبدیل ہو جاتے ہیں کہ شاعر کے نصب العین اور مطمحِ نظر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ۔ ان میں جتنے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتے، شاعر کی شخصیت سے اتنی ہی جزوی شخصیتیں جدا ہو جاتی ہیں اور اگر محرومی کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے تو اتنی جزوی شخصیتیں اصل شخصیت سے خارج ہو جاتی ہیں کہ شاعر کی شناخت جو اس کے خوابوں سے وابستہ ہو گئی تھی انتہائی مدھم اور موہوم جاتی ہے اور بالآخر شاعر اپنے وجود اور شناخت کا منکر ہو جاتا ہے ۔ زندگی کی ان محرومیوں اور داخلی شکست و ریخت کی سب سے کامیاب تصویر کشی اختر الایمان نے اپنی نظم 'ایک لڑکا' میں کی ہے ۔ اس نظم کو سامنے رکھ کر بہت سی نظمیں کہی گئیں جنھیں ادبی وقار اور اعتبار بھی حاصل ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی سے اختر الایمان کا تتبع نہیں ہو سکا ۔ خصوصاً 'لڑکے' کے کردار کو مشخص کرنے میں اختر الایمان کا فن بام عروج پر پہونچ گیا ہے اور کلائمکس ۔

یہ لڑکا مسکراتا ہے اور آہستہ سے کہتا ہے　　یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

کی بلندی تک پہنچتے پہنچتے تو بہتوں کی سانسیں پھول گئیں اور بعضوں نے خون تھوک دیا لیکن اختر الایمان کی فکر کے ایوان بلند کے ابتدائی زینے ۔

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم

کی شعوری یا غیر شعوری تقلید میں جن شعراء نے اپنے فکر وفن کا بھرم رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے ان میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور رضوان سعید بھی شامل ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اپنی نظم ''باز دید'' میں کافی ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے۔ مدتوں بعد جب شاعر سے ثمینہ کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ بے حد مضطر و مضطرب انداز میں پوچھتی ہے کہ آپ سلیمان اطہر جاوید تو نہیں؟ اس سوال نے شاعر کے دل کے ان تمام مندمل زخموں کو ہرا کر دیا جو ماضی میں ثمینہ کی بے وفائی کے ہاتھوں پہنچے تھے۔ شاعر کا وجود ایک لمحے کے لئے ٹوٹ کر بکھرنے کے قریب ہو جاتا ہے لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے جھنجھلا کر جواب دیتا ہے ؎

اس وفا پیشہ نے تو عرصہ ہوا پائی وفات　　میں تو اس شخص کے لاشے کو لئے پھرتا ہوں

اس کے برخلاف رضوان سعید کی نظم ''یورش رفتگاں'' میں کسی مخصوص واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا لیکن بحیثیت مجموعی پوری نظم کے باطن میں ایک طرح کی داخلی کشمکش اور بے یقینی کی فضا طاری ہے اور شاعر اپنے وجود کے 'ہونے' اور 'نہ ہونے' کے درمیان معلق ہے ؎

بدل جائیں نگاہیں کاش دل تبدیل ہو جائے
غبار جسم اڑ جائے یہ جاں تبدیل ہو جائے
خلاؤں کی لچیلی سوزنی آواز گھٹ جائے
اس آوارہ سے دریا کا سریلا ساز گھٹ جائے
اُگیں پھولوں پہ شبنم اور نہ میری داستاں پنپے
نہ اب کہرے کی وادی میں یہ نیلا آسمان پنپے
نہیں رضواں نہیں ہوں میں
نہیں ممکن نہیں ایسا!

لیکن رضوان سعید کا سب سے پرکشش اور دلنشیں کلام غالباً وہ ہے جس میں ان کی جملہ درویشانہ صفات سرمستی و سرشاری، استغنا و بے نیازی، قناعت و خودداری، سخاوت و فیاضی اور فقیری و قلندری کی روح جلوہ گر ہے۔ نعمتِ دنیا تمام تر آرائشوں اور زیبائشوں کے ساتھ ان کے دامن سے لپٹنا چاہتی ہے، جنتِ ارضی حسین تر انجمن آرائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ ان کو آواز دیتی ہے لیکن یہ مست مئے الست ہے کہ بے پرائے جادہ و منزل ایک موج بے قرارِ دل کے اشارے پر رواں دواں ہے ؎

☆ میں نے کیا کیا نہ پکارا اسے رضواں رضواں　　بے خبر ہوش کی وادی سے گزرتا ہی گیا
☆ مرا نصیب کہو یا مرا جنوں کہہ لو　　نئے ٹھکانے بنانا بنا کے چل دینا
☆ لٹے لٹے سے چلے تھے کہ اک صدا آئی　　ہمیں بھی اپنی محبت کے چند پل دینا
☆ مجھے کیا کہ میں ایک مجذوب شاعر　　رکی ہو کہ اب زندگی چل رہی ہو

☆ رہوں ہمیشہ میں گھر در کی قید سے آزاد مرے چہار طرف صرف لامکاں رہ جائے

یہی گھر در سے آزادی اور لامکانیت کی قید قلندر کو 'من بندۂ آزادم عشق است امامِ من' کی تفسیر بنا دیتی ہے اور وہ تمام مصلحتوں کو پائے قناعت وخودداری سے ٹھوکر مار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا اور حب دنیا پر چار تکبیریں پڑھ دیتا ہے ۔

☆ اصول عشق ہوں پھر مصلحت پسندی کیا میں وہ مزاج ہوں جس پر کسی کا رنگ نہیں

☆ ہم تو جھکنے سے رہے یار کسی کے آگے آپ ہی مانگئے دنیا سے محبت کا سلوک

رضوان سعید کی شاعری کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تیز وتند فکر کہیں کہیں ساغرِ سرجوش کی شکل اختیار کر گئی ہے اور اس کی مئے آتشیں سے آبگینے پگھل گئے ہیں۔ اس قبیل کے اشعار گویا اپنے قاری سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی شراب (فکر) پر توجہ مرکوز کی جائے اور جام (الفاظ) سے صرف نظر کیا جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

صلح پسند جنوں سب کا پاسباں ہو جائے خرد بھی چاک ہو وحشت بھی دھجیاں ہو جائے

☆ پسِ زندگی جفا کی خودغرضیوں میں بیٹھا مری داستاں کا ظالم عنواں بدل رہا ہے

☆ خار ٹوٹے ہوئے شیشے غبار جاں وحشت لاکھ بھٹکا کئے دل سا کوئی صحرا نہ ملا

☆ بھیگی وہ آستیں کہاں وہ تر بہ تر سے لب کہاں مست نگاہِ ناز پہ توبہ کہ مئے حرام ہے

☆ جواں ہے ابھی گورا گورا تقدس شمع بجھ گئی روشنی رہ گئی ہے

اہل نظر جانتے ہیں کہ خط کشیدہ الفاظ نے شتر بے مہار ہو کر شاعر کے حکم سے سرتابی اختیار کر لی ہے لیکن اس طرح کے اشعار دیگر اشعار کی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں ع

حق کی تمیز ہوتی ہے باطل کے سامنے

بہ حیثیت مجموعی رضوان سعید کا کلام زندگی کا سچا آئینہ دار ہے۔ زندگی اپنی تمام تر خصوصیات، سرد وگرم، تلخ وشیریں، رطب و یابس، کیف وکرب، عیش وغم، عسرت وعشرت اور اشک وتبسم کے ساتھ ان کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ رضوان سعید کی شاعری کے مطالعے کے وقت اکثر مواقع پر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم شاعری کا نہیں منظوم زندگی کا مطالعہ کر رہے ہوں۔

☆☆☆

اودھ کا ایک فارسی شاعر: مظفر علی اسیرؔ

انجمن بانو صدیقی (ڈاکٹر)
لکھنؤ

ہر کس کہ ہست منکر حسن کلام من　　بیند اسیرؔ ایں غزل عاشقانہ من

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں ان میں علم وادب کے فروغ کے سلسلے میں اودھ ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اودھ کی ادبی شہرت میں اس کے قصبات کا بڑا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر ہم موہان، گوپامؤ، سندیلہ، بلگرام، کاکوری، ملیح آباد، خیر آباد، لاہر پور، ہرگام، امیٹھی، سلون، انہونہ کے نام لے سکتے ہیں۔ سطور ذیل میں اودھ کے ایک معروف قصبہ امیٹھی کے ایک شاعر کا تعارف مقصود ہے جس کی تفصیلات اس طرح ہیں:

سید مظفر علی نام، تدبیر الدولہ مدبر الملک، خان بہادر جنگ خطاب تخلص اسیرؔ، والد کا نام میر مدد علی جو مشہور بزرگ سید محمد صالح کروڑی کی اولاد میں تھے اور ان کا سلسلۂ نسب حضرت عباس علم بردارؓ پر منتہی ہوتا ہے(۱)۔ اسیرؔ ۱۶۔۱۲۱۵ھ کے درمیان امیٹھی میں پیدا ہوئے تھے(۲)۔ معروف تذکرہ نگار نواب نور الحسن خاں اپنے تذکرے میں ''نگارستان سخن'' میں ان کے سلسلے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

" سید مظفر علی اسیرؔ ابن میر مدد علی مسکن امہاتش بیت الریاست لکھنؤ است و قصبۂ امیٹھی از نواح آں وطن آبائی او از قبائل شرفاء و سادات(۳)۔''

اسیرؔ عہد طفولیت میں ہی اپنے نانیہال لکھنؤ آ گئے اور خمخانۂ جاوید کی روایت کے مطابق یہیں بارہ سال کی عمر میں شیخ زادگان میں وہ رشتۂ مناکحت میں منسلک ہو گئے(۴)۔ اسیرؔ کا دادیہال اور نانیہال صاحبان علم وفضل سے بھرا تھا۔ انہوں نے فارسی کی تعلیم اپنے والد میر مدد علی سے حاصل کی۔ عربی زبان کی صرف ونحو اور دیگر علوم وفنون کی تعلیم اپنے عم نامدار سید علی اور علمائے فرنگی محل سے حاصل کی۔ اسیرؔ نے مسند درس وتدریس کو بھی رونق بخشی اور بکثرت شاگردوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ قسام ازل نے انہیں ذوق سخن بھی عطا کیا تھا، شعر گوئی میں انہوں نے اس عہد کے نامور استاد غلام ہمدانی مصحفیؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور استاد کے منظور نظر ہو گئے۔ اس سلسلۂ شاگردی کو ہنوز دو برس ہی بیتے تھے کہ مصحفیؔ کے انتقال کا حادثہ فاجعہ پیش آ گیا اور اس کے بعد انہوں نے کسی دوسرے سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔

تحصیل علم کے بعد اسیرؔ کو فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ یہ نصیر الدین حیدر شاہ (مدت حکومت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء) کا زمانہ تھا۔ ان کو محکمۂ صدر میں امین کی ملازمت ملی جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی اور ایمانداری سے انجام دیا۔ نصیر الدین حیدر کے انتقال (۱۸۳۷ء) کے بعد نواب امجد علی شاہ اودھ کے تاجدار بنے۔ اس وقت نواب امیر الدولہ

شاہ اودھ کے ناک کا بال تھے اور ان سے اسیرؔ کے قریبی تعلقات تھے۔ نتیجتاً ان کی عنایت اور سفارش سے اسیرؔ کو میر منشی جیسے باوقار عہدے پر فائز کیا گیا اور ان کی زندگی فارغ البالی سے بسر ہونے لگی لیکن گردش ایام سے مفر کہاں؟ حالات بدلے۔ امین الدولہ کے برے دن آتے ہی اسیرؔ بھی بلائے ناگہانی میں مبتلا ہو گئے اور اپنے محسن سے تعلقات کی پاداش میں ان کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ نواب واجد علی شاہ کا عہد حکومت (۱۸۴۷ء۔۱۸۵۶ء) ان کے لئے سازگار ثابت ہوا جنہوں نے ان کی قدر دانی کرتے ہوئے روزینہ مقرر کیا۔ خوبیٔ قسمت سے نواب کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا جنہوں نے القاب و خطابات سے بھی نوازا اور بعض روایات کے مطابق ان کو بادشاہ کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ لیکن اعزاز و اکرام اور سکون و چین کی مدت بہت مختصر رہی اور ۱۸۵۶ء میں انتزاع اودھ نے ایک بار پھر انہیں اقتصادی بدحالی کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا اور لکھنؤ سے دلی لگاؤ کے باوجود حالات کی نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسیرؔ نے رامپور کا رخت سفر باندھا کیونکہ انہیں یہ امید تھی کہ نواب محمد سعید خاں (مدت حکومت ۱۸۴۰ء۔۱۸۵۵ء) کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ان کے صاحبزادوں کی تعلیم کی ذمہ داری اسیرؔ کے سپرد تھی شاید اس شناسائی سے فکر معاش کا حل نکل سکے۔ طالع مساعد تھا رامپور پہنچے تو ان کے شاگرد نواب یوسف علی خاں (مدت حکومت ۱۸۵۵ء۔۱۸۶۵ء) تخت نشین تھے جنہوں نے ان کی سرپرستی اور قدر دانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مزید برآں اپنے کلام پر مشورہ لینے لگے۔ اسیرؔ کی قسمت میں بھی راوی نے چین لکھ دیا مگر یہ سلسلہ طویل مدت تک قائم نہ رہا اور نواب کے انتقال نے صورت حال بدل دی مگر نواب کلب علی خاں (مدت حکومت ۱۸۶۵ء۔۱۸۸۷ء) نے اپنے والد کے استاد کی حیثیت سے ان کو نوازا۔ وہ مدتوں ریاست رامپور سے منسلک رہے لیکن وطن کی محبت سے مجبور ہو کر وہ چھ ماہ رامپور میں رہے تو چھ ماہ لکھنؤ میں بسر کرتے۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا اور ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں انہوں نے رامپور میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مظفر علی اسیرؔ کو فارسی اور اردو زبانوں میں مہارت حاصل تھی لکھنؤ اور دہلی اسکول میں زبان و ادب کے سلسلہ میں جو مناقشے ہوتے تھے اسیرؔ اس سلسلہ میں غیر جانبدار رہتے تھے اور اگر دہلی کے کسی شاعر کا کلام عمدہ ہوتا تھا تو وہ ایک خوش مذاق مبصر اور ایک صالح مزاج نقاد کی طرح دل کھول کر اس کی تعریف کرتے۔ اسیرؔ کا شمار اپنے عہد کے استاد شعراء میں ہوتا تھا۔ ان کے حلقۂ تلمذ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ شامل تھے صرف لکھنؤ میں ہی ان کے شاگردسیکڑوں کی تعداد میں تھے جن میں منشی احمد علی شوقؔ، فضول رسول واسطیؔ، اسد، جرار، افضل اور امیر مینائی وغیرہ شامل تھے۔ اس سلسلہ میں ''انتخاب یادگار'' کی شہادت ملاحظہ ہو۔

''اوصاف میں بھی بے عدیل ہیں ایک قافلے کے کے سالار اور کفیل ہیں (۵)۔''

صاحب گل رعنا حکیم سید عبدالحئ مہر جہاں تاب کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

" ----- و بہر جا در فکر صید بر جستہ مضامین رنگین می نماید سر آمد شعرای روزگار آن دیارست و استاد موزوں طبعان خوش گفتار(۶)۔''

''نگارستان سخن'' کے مولف ان کی نظم و نثر پر مہارت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شاعری بلند فکر، عالی پایه و دبیری نیکو تحریر گران مایه۔۔۔ (۷)"

اسیرؔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں "انتخاب یادگار" میں ان کی منظوم تصانیف سے تعلق یہ اطلاع ملتی ہے:

"ایک دیوان فارسی مسمیٰ بہ گلشن تعشق ہے۔۔۔(۸)"

اسیرؔ کو جملہ اصناف شاعری پر قدرت حاصل تھی۔فن عروض پر مہارت تامہ حاصل ہونے کی بنا پر کلام ایک طرف تو اسقام وعیوب سے پاک ہے تو دوسری طرف محاسن شعری سے آراستہ ہے۔

"گلشن تعشق" کے بارے میں تفصیلات اس طرح ہیں:

نام "گلشن تعشق" شاعر مظفر علی اسیرؔ لکھنوی زبان فارسی

سائز ۱/۲، ۷x۱۱ انچ ۷ سال طباعت ۱۲۷۰ھ تعداد صفحات ۲۱۷، مطبع، علوی پریس لکھنؤ

دیوان کی ابتداء حمد ونعت سے ہوتی ہے جس میں تیرہ اشعار ہیں، اس کے بعد ردیف میں الفبائی ترتیب کی رعایت ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تین سو پچاس غزلیں، متفرقات میں مثلث، قطعات، ترکیب بند، مناجات، مخمس بر غزلیات صائبؔ، حافظ، ناصر علی سرہندی اور مصحفی وغیرہ کے علاوہ تین قصائد، ایک مثنوی بے نقط اشعار واشعار منقوطہ وغیرہ ہیں۔ اسی کے ساتھ بیالیس قطعات تاریخ بھی ہیں جن کے مطالعہ سے فن تاریخ گوئی سے ان کے شغف اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

اسیرؔ کے کلام پر سیر حاصل گفتگو کا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں ہوسکتا لہٰذا ان کی غزلوں میں سے چند اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کی شعر گوئی کی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے:

☆ تلون پیشه ام نیرنگئ من رنگها دارد — منم گلخن منم گلشن منم دریا منم صحرا

☆ نے امتحان ز دوست نه از دشمن انتقام — بگذاشتم نیك و بد روزگار را

☆ سرمه گشت استخوان ولی شادیم — گوشهٔ چشم اوست خانهٔ ما

جام جمشید که احوال جهان بود درو — ساغری بود ز خاك در میخانهٔ ما

☆ از یاد رفت ذائقهٔ زخم اولین — در اشتیاق لذت زخم دگر مرا

☆ در مکتب عشق تو که باشد همه حکمت — طفل است فلاطون و معلم خرد ما

☆ از ضبط گریه کلفت دل میشود فزون — آبی ز چشم ریزد که شوید غبار را

☆ دارا بملك خویش و بمیخانه من خوشم — دارد سکندر آئینه من خشت و خم بدست

☆ اسیرؔ از من اگر پرسی گریز از پارسائی کن — صفائی قلب از فیض شراب ناب می گیرد

☆ ز چشم خلق نهان گر کنی گناه چه سود؟ — که عضو عضوبه محشر گواه خواهد شد

☆ شنیده ام سخنی از زبان آئینه — که هر که دید ترا خویش را نمی بیند

☆ تو کی ای شوخ می آئی که بر بالین بیمارست — اجل هم با هزاران ناز معشوقانه می آید

☆ لذت زخم محبت ز دلم پرس اسیرؔ — تیرہا خوردہ ام ز جنبش مژگانی چند
☆ تاب احسان کسی نیست مرا بسکہ اسیرؔ — درد اگر مرگ بود منت عیسیٰ نبرم
☆ تلخ کامیہائی ہجر اوست چندان اسیرؔ — میوۂ شیرین نہ بخشد لذتی در کام من

حواشی:

(۱)انتخاب یادگار،ص۱۳،۔(۲)چونکہ خمخانہ جاوید نے اسیرؔ کی موت ۱۲۹۹ھ بہ عمر ۸۴ برس تحریر کی ہے،اس بناء پر ۱۲۹۹ھ سے ۸۴ گھٹانے پر ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتا ہے اسلئے ۱۲۱۵ھ یا ۱۲۱۶ھ کو ان کا سنہ ولادت قرار دیا جاسکتا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خمخانہ جاوید جلد اول ص ۲۹۹،۔(۳)نگارستان سخن،ص ۶۔(۴)خم خانۂ جاوید جلد اول،ص ۲۹۹،۔(۵)انتخاب یادگار، ص ۱۴۔(۶)مہر جہاں تاب فخر الدین خیالیؔ (بحوالہ گل رعنا حکیم عبدالحئ حسنی ص ۳۹۶)۔(۷)نگارستان سخن،ص ۶۔(۸) انتخاب یادگار،ص ۱۴

کتابیات:

(۱)(منشی)امیر احمد مینائی،انتخاب یادگار،تاج المطابع،رامپور،۱۳۰۹ھ۔
(۲)(لالہ)سری رام،خمخانہ جاوید،مخزن پریس،دہلی،۱۹۱۸ء۔
(۳)(حکیم)عبدالحئ رائے بریلوی،تذکرہ گل رعنا،معارف پریس اعظم گڑھ،۱۳۷۰ھ
(۴)(نواب)نور الحسن،نگارستان سخن،مطبع شاہجہانی،بھوپال،۱۲۹۳ھ

☆☆☆

فرهنگ مشترک هند کا علمبردار-داراشکوه

(عہد حاضر کے دانشوروں کی نظر میں)

محمد قمر عالم،
شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہندوستانی تہذیب وتمدن اور فرہنگ مشترک کو مکمل وسعت دینے والا، شہنشاہ اکبر کے نظریۂ صلح کل کو بڑھاوا دینے والا، ہندوستانی تصوف کو ایک نیا رنگ دینے والا، تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والا، تمام تیموری شہزادوں میں سب سے بڑھ کر علمی ذوق وشوق رکھنے والا، عربی، فارسی اور سنسکرت جیسی عمیق زبانوں پر یکساں قدرت رکھنے والا، شہزادہ محمد داراشکوہ ہندوستان کے عظیم مغل شہنشاہ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا ۱۹ صفر ۱۰۲۴ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو اجمیر کے ساگرتال جھیل کے نزدیک مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی دعاؤں سے پیدا ہوا، جس کے بارے میں سکینۃ الاولیاء میں خود رقمطراز ہے:

" ولادت این فقیر در خطۂ اجمیر، بالای ساگر تال روی داده، در صلخ صفر، نصف شب روز دو شنبۂ سال یك هزارو بیست و چهار هجری ، چون در خانۂ والد ماجد فقیر سه صبیه شده بود و پسر نمی شد و سن مبارك آن حضرت به بیست چهارگی رسیده بود ، از روئ عقیده و اخلاصی که آن حضرت نسبت بخواجه معین الدین چشتی داشتند بهزاران نذر و نیاز درخواست پسر نمودند و ببرکت ایشان حق تعالیٰ این کمترین بنده های خود را بوجود آورد ۔" ۱

سلطنت ہند کا شہزادہ ہونے کے سبب دارشکوہ کی تعلیم وتربیت شروع سے ہی اس عہد کے اعلیٰ مرتبت علماء و فضلاء کی زیرنگرانی ہوئی، مروجہ علوم کی تعلیمات ملا عبداللطیف سلطان پوری سے، دیگر تربیت اخوند میرک سے، زہد وتقویٰ میاں میر سے، اور شیخ بدخشی سے پیری ومریدی کے اصول وآداب سیکھنے کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان وادب پر بھی کامل دسترس حاصل کی۔ داراشکوہ ایک اچھا مورخ، مصنف اور مترجم تھا اس نے سنسکرت کی متعدد کتابوں کا فارسی میں بذات خود ترجمہ کیا اور دوسرے استادوں سے بھی ترجمہ کرایا، اس کا مطالعہ بیحد وسیع تھا۔ تقابلی مطالعۂ مذاہب میں دارا کو کافی دستگاہ حاصل تھی، زندگی کا نصف سے زیادہ حصہ علم وقلم کی رفاقت میں گزرا علاوہ ازیں داراشکوہ کا شمار عہد شاہ جہانی کے خوش نویسان میں بی سرفہرست نظر آتا ہے، اس نے فن خطاطی کا ہنر مشہور خوش نویس استاد ملا عبدالرشید سے حاصل کیا تھا۔ دارا شکوہ کی اپنے زمانے کے ادبی وعلمی وزبان وفلسفہ ودیگر فنون لطیفہ کے ماہرین سے بہت زیادہ وابستگی رہی ہے، جنکی صحبت سے اس نے خوب استفادہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں اس نے کئی معرکۃ الآراء تصنیفات کی تخلیق کی جن میں سفینۃ الاولیاء،

سکینۃ الاولیاء، رسالۂ حق نما، حسنات العارفین، مجمع البحرین، ترجمہ اوپنیشد بنام سر اکبر، طریقۃ الحقیقت، دیوان بنام اکسیر اعظم اپنی تاریخ تخلیق سے لے کر آج تک محبوب قارئین ہیں۔

دارا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صوفیاء اور فقراء کے ساتھ گذارا جو کہ اس کی تخلیقات سے عیاں ہے۔ اس نے ہندو اور اسلامی حقائق کے مطالعہ کے سلسلے میں اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم تصوف کے مختلف سلاسل اور قرآن و اوپانیشاد کا بھی عمیق مطالعہ کیا، چونکہ سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی دعا سے پیدا ہونے کی وجہ سے بھی دارا شکوہ کی طبیعت کا میلان متصوفانہ عقائد کی تلاش و جستجو میں مسلسل مبتلا رہتا تھا اپنی اسی خواہش کو حاصل کرنے کے سبب اس نے علوم متداولہ سے فراغت کے بعد ہندوستان کے مختلف صوفیاء سے اپنے راہ و رسم استوار کئے اور ان بابرکات شخصیات کی صحبت میں رہکر تصوف کے رموز و نکات سے آگاہی حاصل کی۔ دارا شکوہ نے جن صوفیاء کی صحبت سے استفادہ کیا ان میں میاں جیو، ملا شاہ بدخشی، شاہ محبّ اللہ الہ آبادی، باب لال دیال، سرمد شہید، شاہ دلربا، پنڈت جگن ناتھ وغیرہ جیسی شخصیات قابل ذکر ہیں، سکینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ لکھتا ہے:

" دل من پیوسته فریفتهٔ درویشان می بود و اوقات در جستجو ایشان می گزاشت و در صدد آن شد که درك کند مشرب موحدان هندو و محققان این قوم قدیم نماید مکرر صحبت ها داشت جز دریافت و شناخت چیزی تفاوتی نه دید۔"۲

دارا شکوہ کے اس صوفیانہ مزاج میں پہلے میاں میر جیو اور پھر ملا شاہ بدخشی کی صحبت کا بہت بڑا دخل تھا، اسلامی تصوف کا تصور میاں صاحب کی تمام تر تعلیمات میں تھا جس میں دارا کی دینی علمی و روحانی تشنگی نے خوب غوطہ زنی کی یہ کوئی معمولی دل نہیں تھا بلکہ یہ دارا کی فہم و فراست ہی تھی جس نے اتنی آیات، احادیث، اخبار، روایات و احوال اور اشعار کو لفظ بہ لفظ یاد رکھا۔ دارا شکوہ کو بزرگوں اور اہل اللہ سے انتہائی عقیدت تھی خود کو ان کے قدموں کی خاک سمجھتا تھا اور دنیا میں ان کے احوال و افکار سے بہتر کوئی دوسرا شغل نہیں جانتا تھا۔ ان کے واقعات اور عمل صالحہ کو قلم بند کر لینا ہی دین و دنیا کی سعادت شمار کرتا تھا۔ دل میں اسی عقیدت اور محبت کو رکھتے ہوئے اس نے آں حضرت رسول اکرم ﷺ، خلفائے راشدین، ائمہ اکرام، ازواج مطہرات، دختران پیمبر اسلام کی عابدہ و زاہدہ خواتین اسلامی درویشوں اور بزرگوں اور اہل اللہ کے احوال بیان کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔

دارا نے اپنی تمام تر تصانیف میں قرآن کریم اور بزرگان دین سے سچی عقیدت کا دامن نہیں چھوڑا، قرآنی تعلیمات کا جگہ جگہ حوالہ دینا اور اپنے عزائم و افکار کو اس کی آیات و ہدایت کے مطابق استعمال کرنا اس کا اولین مقصد تھا۔ دارا کی علمی و ادبی تحریروں میں دنیائے تصوف کا کوئی صوفی، کوئی تالیف در آئے بغیر نہیں رہ سکی ہے اور فارسی کا کوئی شاعر بھی شاید دارا کی نظر سے بچ سکا ہو خاقانی، سنائی، احمد جام، ژندہ پیل، محمود شبستری، قاسم انوار، رومی، نظامی، سعدی، کمال خجند، سلطان ولد، امیر خسرو، عراقی، خواجہ حافظ، اور مولانا جامی کے اشعار کو پسندیدگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

دارا کی طبیعت میں شعر و شاعری کا ذوق ان ہی شعراء کے کلام کے مطالعہ کا اثر تھا چونکہ اس کو سلسلۂ قادریہ پر ناز

تھا اسی لئے شاعری میں اس نے قادری تخلص اختیار کیا۔ جیسے یہ بزرگ صوفیاء حال وقال، وجد وسماع، جلوت وخلوت، صبر و توکل، زہد وقناعت کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے تھے، کعبہ وکلیسا، دیر وحرم، صومعہ وسومنات کو یکساں نظریہ سے دیکھتے تھے۔ یہی فکر دنیا سے بے نیازی من وتو اور کفر وایمان کے امتیاز کو ختم کر دیتی ہے، یوسف الچکلی، ہشام شیرازی، سعد الدین ہموی، قاسم انوار، محمود شبستری، بوعلی قلندر پانی پتی اور عراقی کے اشعار دارا کو توحید ومعرفت کا درس دے رہے تھے۔ دارا نے اپنا نظریۂ توحید ومعرفت اور انسان کامل اپنے دیوان میں اس طرح واضح کر دیا ہے:

آدمی قدر خویش می دانی — کہ تویی گنج سر پنہانی
دست و پای تو نقش الله است — چون ید الله را نمی خوانی
خلق آدم بود بصورت حق — زان خلیفه شدی و سلطانی
دل تو عرش کرسی و لوح است — کہ اندرون هست علم ربانی
روح خود در دمید اندر تو — زان ترا سجده کرد روحانی
هم محمد توی و هم الله — این عنایت تراست ارزانی[۳]

داراشکوہ نے ایک طرف جہاں قرآن کریم اور احادیث واقوال بزرگان دین کا عمیق مطالعہ کر کے اسکی تعلیمات کو اپنی تصنیفات میں جگہ جگہ استعمال کیا تو دوسری طرف اوپانیشاد اور ھندو مذہب کے عقاید وافکار کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اس نے اپنی تحریروں کے حوالے سے دونوں مذاہب کے مابین یکسانیت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جہاں سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء جیسی قابل فخر تصنیفات کی تخلیق کی تو وہیں سر اکبر اور مجمع البحرین جیسی عظیم تصنیفات سے بھی دنیای علم وادب کو روشناس کروایا۔ دارا نے ھندو مذہب کے مشہور گرنتھوں کا سنسکرت سے فارسی زبان میں ترجمہ بذات خود اور پنڈتوں کی مدد سے اسلئے کروایا تا کہ مسلمان بھی فارسی کے ذریعہ ھندو مذہب، فلسفہ، تہذیب اور رسم ورواج سے آشنائی حاصل کر سکیں۔ داراشکوہ نے دونوں مذاہب کا عمیق مطالعہ کر کے ان میں یکسانیت کو پیش کیا۔ اس نے مجمع البحرین میں ھندو و مسلم عقائد اور فلسفہ میں یکسانیت کو بڑے سلیقے سے بیان کیا۔ ذیل میں فرھنگ مشترک ھند کے فروغ میں داراشکوہ کی خدمات کو عہد حاضر کے دانشوروں کی تحریروں کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔

عہد حاضر کے مشہور ومعروف استاد پروفیسر انوار احمد بھی داراشکوہ کی فرہنگ مشترک ہند کے میدان میں کی گئی گراں قدر خدمات کا اعتراف یوں کرتے ہیں کہ داراشکوہ نے وحدت الوجودی فکر کے فروغ میں صمیمانہ وصادقانہ کوششیں کیں ہندو و مسلم مذہب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش کی، تا کہ ہمارے ملک کی عوام صلح وآشتی، ہم آہنگی وہم دلی کے ساتھ زندگی گزارے، انوار صاحب اپنے مقالہ بعنوان ''تفاوق فکری وتبادل فرہنگی مابین ہندوایران'' میں یوں رقم طراز ہیں:

" دارا شکوه یك مفکر وحدت الوجودی بوده، صمیمانه و صادقانه کوشش ها نمود که از ترکیب و تطبیق اندیشه های این دو مذهب هندو و مسلمان یك محیط سازگار برای جمیع ساکنان این کشور ایجاد کند۔ او در این کشور یك جامعه ای را

بتصـور مـی آورد که از منازعت و منافرت فرقه ای کاملاً پاك بود و افراد آن جامعه جاده صلح و آشتی هم آهنگی و هم دلی مسلوك داشته باشند۔'' ۴

سنسکرت زبان کی استاد پروفیسر سلمہ محفوظ نے بھی اپنے مضمون 'داراشکوہ اور اوپانیشد' کے ذریعہ شہزادہ داراشکوہ کی ہندو مسلم مذاہب میں یکسانیت، ویدوں اور قرآن کے حوالوں کے ذریعہ دارا کی ادبی حیثیت اور فرہنگ مشترک کو بڑھاوا دینے میں اسکی خدمات کو پیش کیا ہے۔ سلمہ محفوظ صاحبہ نے داراشکوہ کی سنسکرت زبان سے دلچسپی، دارا کے سنسکرت سے فارسی تراجم، اوپانیشد کے بارے میں دارا کی رای وغیرہ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر نورالحسن انصاری، شہزادہ داراشکوہ کی فرہنگ مشترک ہند کے فروغ میں کی گئی اہم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے داراشکوہ کے ذریعہ کئے گئے سنسکرت سے فارسی تراجم سرا کبر اور مجمع البحرین کی مناسبت سے ہندو و مسلم مذاہب میں یکسانیت انسان گرامی واخوت جہانی جیسی خدمات کو پیش کرتے ہیں، بادشاہ اکبر نے جس صلح کل اور مذہبی یکسانیت کی بنیاد رکھی تھی اس کے پوتے دارا نے بھی اس پر عمل کیا پروفیسر انصاری اکبر اور دارا کی خدمات میں فرق کرتے ہیں کہ اکبر نے جہاں ہندو اور مسلم مذاہب کی یکسانیت کے لئے ایک گروہ قائم کیا وہیں داراشکوہ نے دوسروں پہ بھروسہ نہ کرتے ہوئے خود اپنے قلم کے ذریعہ ان خدمات کو انجام دیا، بقول پروفیسر انصاری:

Dara Shikoh who ddicated his entire life to Hindu-Muslim unity, translated the Upanishads into persian under the title of Sirre Akbar. Dars Shikoh believed that the essence of islam and hinduism is one, the dfifference being only in formal ceremonies and outwards customs. As a matter of fact, Dara Shikoh carried on the great policy of "Human Unity and Universal Peace" propounded by his great grand father Akbar, the great, with the difference that Akbar had assambled a board of eminent hindu and muslim intellectuals for this purpose, while Dara shikoh struggled for this noble cause with his on pen leaving aside the laxurious princely life that he could enjoy to full.[5]

داراشکوہ کی تاریخی تہذیبی اور ادبی حیثیت کے ساتھ فرہنگ مشترک ہند کے فروغ میں اس کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار نے ایک پرمغز مقالہ تحریر کیا ہے اس مقالہ میں جگدیش سرکار نے داراشکوہ سے متعلق کئی اہم اطلاعات پر اظہار خیال کیا ہے. انہوں نے اپنے اس مضمون '' Place of Dara Shikoh in India's Cultural History'' میں

The age of Dara, Dara's mental make up, Dara's spiritual quest, Hindu

ascetics and assosiates, creative literary output, spiritual contribution and from Dara to Raja Ram Mohan Roy.[6]

جیسے عنوانات کے تحت بڑی اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔ فارسی کے معروف استاد پروفیسر امیر حسن عابدی نے بھی اپنے ایک مقالہ میں داراشکوہ کی فرہنگ مشترک ہند کے فروغ میں خدمات کا یوں اعتراف کیا ہے:

Dara shikoh is an unperalleted symbol of our national integration, while his Sirr-e-Akbar the Persian translation of fifty Upanishads, is a mile stone in the history of Indo Persian literature.[7]

پروفیسر حافظ محمد طاہر علی نے بھی شہزادہ محمد داراشکوہ کے ذریعہ کئے گئے سنسکرت سے فارسی میں تراجم کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں کہ اگر دارا کے ذریعہ ان اوپانیشد کا ترجمہ نہ ہوا ہوتا تو شاید ہندوستان کی اس عظیم وراثت سے دنیائے ادب واقف نہ ہو پاتی:

Dara made laudable contribution in the field of Indology by highlighting the escence of Hinduism explaining the philosophy and making the persian knowing people aware of Indian Wisdom through his persian works. Dara wrote, compiled and translated a number of books but his most important work was Sirr-e-Akbar, a persian translation of fifty chapters of the Upanishad which he completed within six months..... This valuable and precious treasure of indian wisdom would have not been known to the scholarly world if Dara Shikoh had not translated into Persian.[8]

فارسی ادب کی مشہور و معروف استاد پروفیسر آذرمی دخت صاحبہ جو کہ خود فرہنگ مشترک ہند کی زبردست دلدادہ ہیں نے داراشکوہ کے ہندو و مسلم مذاہب سے متعلق نظریات ہندوستانی تہذیبی وراثت اس کا نظریۂ صلح کل، فرہنگ مشترک ہند کا فروغ کا اعتراف کرتے ہوئے ایک نہایت پرمغز اور پر اعتماد مقالہ تحریر کیا ہے جس میں قابل قدر استاد نے دارا کی تمام تصنیفات کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی ادبی تاریخی ثقافتی تہذیبی مذہبی اور صوفیانہ خدمات کو پیش کیا ہے، دارا کی شخصیت کا احاطہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر آذرمی دخت یوں رقم طراز ہیں:

"This cultured and gentle timuri prince preferred not to wager wars for political gains, rather, he sat out to understand and Interperate the mystical dimention of the religious experience, discarding hatred and conflict there by. The auther of the cultural heritage of India writes that the Indian tradition

remebers Dara Shikoh as a great Mystic Philosphor and the great dream of his life was the brotherhood of all mankind after him the mission of the Unity was lost in the admosphere of hatred and remedy.[9]

آخر میں فرہنگ مشترک ہند کے علمبردار اور داعیِ صلح کل یعنی شہزادہ محمد داراشکوہ کو ہندوستان کے عظیم عالم اور رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کے حوالے کے ساتھ اپنی بات کو ختم کر رہا ہوں:

''سلسلۂ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گزرا ہے وہ ابتداء سے درویش صفت اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا ہمیشہ فقراء اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ وہ ابتداء سے درویش صفت اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقراء وارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کے صاحب ذوق ہونے کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ تلاش و مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ کرتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس عالم میں بھی کفر واسلام کی تمیز ہو تو اعمی اور بصیر میں کیا فرق رہ گیا؟ پروانہ ہو تو شمع ڈھونڈنی چاہئے کہ اگر شمع شمع حرم کا ہی شیدا ہے تو سوز طلبی کامل نہیں۔

عاشق هم از اسلام خرابست و هم از کفر
پروانه چراغ حرم دیر نه داند[10]

حواشی:

۱- سفینۃ الاولیاء، صفحہ ۱۱۷
۲- سکینۃ الاولیاء، صفحہ ۲۵
۳- دیوان، داراشکوہ
۴- انوار احمد، تفاوق فکری و تبادل فرہنگی مابین ہند و ایران (مقالہ)، نقش زبان و ادبیات فارسی در فرہنگ مشترک ہند، بکوشش آذرمی دخت صفوی، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۴

5. Prof.S.N Ansari, Contribution of Persian to Indian culture, Idara-e Adabiyat-e-Delhi, 2007

6. Prof. Jagdish Narain Sarkar,Place of Dara Shikoh in India's Cultural History(Article),Indo-Iranica,Iran Society,Calcutta.

7. A. H. Abidi, India's Composite Culture (Article), Contribution of Persian language and literature to the composite culture of India, ed. A.D.Safavi, Dept of Persian, AMU, Aligarh, 2004.

8. Hz. Md. Tahir Ali, Persian Literature-A treasure house of Indology (Article), Indology and Persian Literature, ed. A.D.Safavi, Dept of Persian, AMU, Aligarh, 2007.

9. Prof.A.D.Safavi,Contribution of Prince Dara Shikoh to the Persio-Indian Sufistic Tradition (Article),Contribution of Persian language and literature to the composite culture of India, ed. A.D.Safavi, Dept of Persian, AMU, Aligarh, 2004.

۱۰- رباعیات سرمد، مقدمہ، صفحہ نمبر ۱۳

☆☆☆

فوائد الفواد (ملفوظات حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ): ایک جائزہ

حافظ شبیب انور علوی کاکوروی (ڈاکٹر)،
پی ایچ ڈی، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔
خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری، کاکوری۔

اسلامی تصوف میں ملفوظاتی اور مکتوباتی ادب کا ایک وافر حصہ ہے۔ یہ ملفوظات اور مکتوبات اپنے عہد کی تاریخ و ثقافت سیاسی، سماجی، ادبی، روحانی، معاشرتی اور تہذیبی وتمدنی حالات کے جاننے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں سب سے پہلے باقاعدہ مستند ملفوظات حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے مرتب کئے گئے۔ مستند سے میری مراد یہ ہے کہ تقریباً سات سو (۷۰۰) سال کے عرصہ میں کسی مورخ و محقق نے اس کی سند پر ایک حرف نہ رکھا۔ ویسے تو ان سے قبل انیس الارواح ملفوظ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ، دلیل العارفین ملفوظ حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتیؒ اجمیری، فوائد السالکین ملفوظ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، راحت القلوب ملفوظ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ قدست اسرارہم بھی ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی کو ہندوستانی صوفیاء کرام کے درمیان جو مرتبہ و مقام حاصل ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ شان محبوبیت کی بناء پر عوام و خواص، امراء و سلاطین، غرباء، درویش و فقراء، علماء و فضلاء، ارباب عقل و دانش اور صاحبان عزیمت و تشنگان معرفت کا جیسا اجتماع آپ کے گرد تھا اس کی مثال نہیں ملتی کیوں کہ آپ کی ذات میں شان محبوبیت کے ساتھ ساتھ تصوف کے عملی و نظری دونوں پہلوؤں کا بڑا حسین اور تابناک امتزاج ہے۔ حضرت محبوب الٰہی کے سلسلہ میں آپ کے شیخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ارشاد گرامی ''اللہ نے تمہیں علم، عقل اور عشق تینوں جوہر عطا فرمائے ہیں اور جس کی ذات میں یہ تینوں یکجا ہو جائیں اس سے مشائخ کی خلافت خوب ہوتی ہے'' کا ظہور مختلف حیثیتوں سے ہوتا رہا۔

فوائد الفواد آپ کا ایک ایسا جامع و دلپذیر ملفوظ ہے جو ارباب تصوف و سالکین راہ حقیقت کے لئے خضر راہ بنا رہا۔ یہ ملفوظ ایک طرف صاحبان دل کے لئے کحل البصر رہا تو دوسری طرف حیات ظاہری (انسانی) کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لئے ایک مکمل دستور رہا اور اس کے ذریعے انسانیت کے بہت سے زخموں کا مداوا ہوتا رہا اور پھر عصر حاضر میں تو اس کی معنویت افادیت اور اہمیت اور بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ یوں تو حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کے حالات و واردات، ارشادات و مواعظ پر مشتمل دوسری کتابیں بھی ہیں جن میں:

۱	دُرِ نظامی	علی بن محمود جاندار	مولفہ ۷۵۰ھ
۲	قوام القصائد	محمد جمال قوام نبیرۂ شمس العارفین قوام الدین	
۳	سیر الاولیاء فی محبۃ الحق جل وعلا	امیر خورد کرمانی	

۴	فوائد الفواد	امیر نجم الدین حسن علا سجزی	
۵	انوار المجالس	خواجہ سید محمد امام بن شیخ بدر الدین اسحٰق و نبیسۂ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ	
۶	تحفۃ الابرار	خواجہ عزیز الدین صوفی نبیسۂ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ	
۷	مجموع الفوائد	خواجہ عزیز الدین صوفی نبیسۂ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	
۸	ملفوظات سلطان المشائخ	مولانا شمس الدین دھاری	
۹	خلاصۃ اللطائف	مولانا علی شاہ جاندار	

اول الذکر چاروں کتابوں کے علاوہ بقیہ دوسری کتابوں کے نام اب صرف تاریخ و تذکرہ میں ہی ملتے ہیں ان کے علاوہ چند معاصر مآخذ و منابع میں بھی حضرت محبوب الٰہی کا تذکرہ و حال ملتے ہیں جن میں:

۱	خیر المجالس	ملفوظات حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ	۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء
۲	احسن الاقوال	ملفوظات حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ	۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء
۳	نفائس الانفاس	ملفوظات حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ	
۴	شمائل الاتقیاء	رکن الدین دبیر کاشانی	مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۲۸ء
۵	بقیۃ الغرائب	خواجہ مجد الدین کاشانی	

مذکورہ بالا کتابوں کے باوصف حضرت محبوب الٰہی کے احوال و کیفیات اور آپ کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے اہم مآخذ فوائد الفواد ہے جس میں ۱۸۸ مجالس میں ہونے والی تمام تر گفتگو آپ ہی کے الفاظ میں قلم بند کی گئی ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف کا سہرا فارسی زبان و ادب کے مشہور شاعر اور غواص معانی، خلد آباد کی سرزمین پر ابدی نیند سونے والے حضرت امیر نجم الدین حسن علا سجزی دہلویؒ (متوفی ۲۹ صفر ۷۳۸ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۳۳۷ء) کے سر ہے۔ فوائد الفواد مشائخ کرام کے ملفوظات میں اس بناء پر بھی خصوصیت کا حامل ہے کہ جامع ملفوظ نے حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کے ملاحظہ گرامی اسے گذارا تھا اور حضرت نے اپنے دست مبارک سے اس میں ترمیم و تنسیخ فرمائی اور وہ ایک لفظ بھی بغیر حضرتؒ کی اصلاح کے ضبط تحریر میں نہ لائے۔ اس کے وہ ابتدائی مسودات جن پر حضرتؒ نے اصلاح و ترمیم فرمائی تھی حضرت حسن دہلویؒ نے اپنی دوسری کتابوں کے ساتھ ایک قبر میں دفن کرا دئے اور اس کے برابر میں خود ان کا مزار بنایا گیا اور اب وہ بظاہر دو مزارات معلوم ہوتے ہیں۔

جامع ملفوظ کا پورا نام سید امیر حسن اور لقب نجم الدین ہے مگر عرف عام میں امیر حسن علا سجزی کے نام سے مشہور ہیں والد بزرگوار کا لقب علاء الدین تھا اسی نسبت سے علا لکھتے تھے وہ بدایوں کے سادات میں سے تھے:

قرشی الاصل ہاشمی نسبم　　کز ہوایش برآمد این شجرم

۶۵۲ھ/ میں بدایوں میں پیدا ہوئے ابتدائے عمر میں دہلی آ گئے حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضری یہیں ہوئی، وہ بچپن سے نہایت ذہین طباع لطیف اور حساس تھے۔ ۱۳ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا فارسی شاعری میں

بہت سی حیثیتوں سے وہ امیر خسروؔ سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں لیکن چونکہ درباری آدمی تھے سلاطین وامراء سے وابستہ رہے اس وجہ سے مینوشی کی بری عادت میں بھی مبتلا ہو گئے ۔ جیسا کہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت محبوب الٰہی ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار مبارک سے فاتحہ خوانی کے بعد واپس تشریف لا رہے تھے اسی دوران آپ کا گزر حوض شمسی کی طرف ہوا وہاں بھی بعض اکابر کے مزارات ہیں یہ حوض اس زمانے میں ایک پر فضا تفریح گاہ بھی تھی ، وہیں کسی جگہ امیر حسن سجزیؒ احباب کے ساتھ شغل مینوشی میں مصروف تھے ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ حضرت کا سامنا ہو جائے گا گھبرا گئے اور اسی عالم بدمستی میں یہ اشعار پڑھے:

سالہا باشد کہ ماہم صحبتیم گر ز صحبتہا اثر باشد کجاست
زہد تان فسق از دل ما کم نہ کرد فسق ما محکم تر از زہد شماست

(عرصہ سے ایک دوسرے سے ہماری ملاقات ہے اگر صحبت میں واقعی کوئی اثر ہوتا ہے تو وہ کہاں ہے آپکا زہد ہمارے فسق وفجور پر غالب نہ آسکا تو گویا ہمارا فسق آپ کے زہد سے زیادہ مضبوط ہے)

لیکن سعادت کی گھڑی آ چکی تھی حضرت محبوب الٰہی کی نگاہ کرم سے ان کی دنیا بدلنا اور فن شاعری کو شہرت دوام بخشا مقدر ہو چکا تھا چنانچہ حضرت محبوب الٰہی نے ان کی طرف تبسم ریز نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا ’’در صحبت اثر ہاست انشاء الله رندی باد‘‘ (صحبت میں تو بڑی تاثیریں ہیں اللہ نے چاہا تو تمہیں عطا فرمائے گا) ان الفاظ اور ان نگاہوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ امیر حسن سجزیؒ کا پورا وجود سلگ اٹھا ، وارفتہ و بیخود ہو کر اسی مدہوشی کی حالت میں حضرتؒ کے قدم مبارک سے لپٹ گئے سر سے کلاہ اتار دی ۔ حضرت ان کی تسکین قلب و تسلی کی خاطر وہاں تھوڑی دیر تشریف فرما رہے پھر آپ خانقاہ شریف میں واپس آ گئے حضرت حسن سجزیؒ پر محبوب الٰہی کی نظر اپنا کام کر چکی تھی چنانچہ اگلے دن حاضر خدمت ہوئے توبہ کی اور بیعت سے سرفراز ہو کر اپنی دنیا و آخرت سنوار لی ، اس وقت حضرت امیر حسنؒ کی عمر تقریباً ۵۵ سال تھی ، خود فرماتے ہیں :

اے حسنؔ توبہ آں گہے کردی کہ ترا طاقت گناہ نماند

(اے حسن ! تم نے توبہ اس وقت کی جب تم میں گناہ کرنے کی طاقت ہی باقی نہ رہی)

مرید ہونے کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ ہر جمعہ کو پابندی سے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نماز کیلوکھڑی کی جامع مسجد میں آپ کے ساتھ پڑھتے تھے ۔

لطافت طبع ، ظرافت ، خوش مزاجی ، تہذیب وشائستگی ، حسن اخلاق ، حسن معاملت ، صاف دلی اور مرشد کی بارگاہ میں مقبولیت میں وہ اپنی مثال آپ تھے ۔ اس کے متعلق مولانا ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں یہ شہادت کافی ہے کہ ’’ چناں شیریں مجلس و ظریف و خوش باش و مزاج داں مودب و مہذب بود کہ ما را راحتے و انسے کہ بمجالست او می شد از مجالست غیر او نیافتم ۔‘‘ (وہ ایسے خوش مذاق ، ظریف الطبع مودب اور مہذب تھے کہ جو محبت و کشش ہمیں ان کی صحبت میں حاصل ہوتی تھی کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ملتی

تھی) حضرت حسن سجزیؒ تمام عمر آزاد رہے اور تجرد کی زندگی گزاری۔ حضرت محبوب الٰہی کے وصال کے بعد دولت آباد ہجرت فرمائی اور وہیں ۲۹ صفر ۷۳۸ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۳۳۷ء روز جمعہ وفات پائی۔

فوائد الفواد میں جامع ملفوظ نے ایسے بیش بہا نسخے تحریر فرمائے ہیں جو حیات انسانی کی کامیابی کے لئے تیر بہدف ہیں۔ یہ ملفوظات حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کے وصال سے تقریباً دو سال سات ماہ پیشتر تک قلمبند کئے گئے ہیں گویا ان کی کل مدت تقریباً پندرہ سال ہوتی ہے اس عرصے میں حضرتؒ کی ۱۸۸ مجالس سے جامع ملفوظ نے استفادہ کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجالس کی تعداد زیادہ رہی ہوں اور جامع نے سب میں سے ان مجالس کا انتخاب کیا ہو۔ جامع ملفوظ نے علم ومعرفت کے اس سمندر کو پانچ حصوں مین تقسیم کیا ہے:

۱	جلد اول	۳۴ مجالس پر مشتمل ہے ۳ شعبان ۷۰۷ھ تا ۲۹ ذی الحجہ ۷۰۸ھ
۲	جلد دوم	۳۸ مجالس پر مشتمل ہے ۲۹ شوال ۷۰۹ھ تا ۱۳ شوال ۷۱۲ھ
۳	جلد سوم	۱۷ مجالس پر مشتمل ہے ۲۷ ذی قعدہ ۷۱۲ھ تا ۲۱ ذی الحجہ ۷۱۳ھ
۴	جلد چہارم	۶۷ مجالس پر مشتمل ہے ۲۴ محرم الحرام ۷۱۴ھ تا ۲۳ رجب ۷۱۹ھ
۵	جلد پنجم	۳۲ مجالس پر مشتمل ہے ۲۱ شعبان ۷۱۹ھ تا ۲۰ شعبان ۷۲۲ھ

جامع ملفوظ فوائد الفواد کی جلد اول مجلد ۲۸ میں (مورخہ ۸ شوال ۷۰۷ھ) فرماتے ہیں،''ان ہی ایام میں میں نے ایک کرامت حضرت شیخ الاسلامؒ کی معائنہ کی کہ میرے پاس کاغذ برائے تحریر فوائد الفواد ختم ہو چکا تھا کہ ایک شخص نے مجھے کاغذ مجلد کر کے دئے میں نے انہیں قبول کرلیا اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے جو ارشادات سنے تھے وہ اس میں درج کر لئے۔ ابتداء میں یہ لکھا، '' سبحان الله و الحمد لله و لا اله الاّ الله والله اکبر ولاحول ولاقوۃ الا بالله العلی العظیم،'' ۔اس کے بعد جو کچھ میں حضرت سے سنتا اس میں لکھ لیتا یہ مجموعہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔ ایک روز ارشاد فرمایا کہ تم نے جو میرے اقوال لکھے ہیں وہ کہاں ہیں، میں نے جو اس وقت تک لکھے خدمت میں پیش کر دئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمائے، شاباشی دی اور فرمایا اچھا لکھا ہے، اسی طرح تمام تحریر ملاحظہ فرما کر تحسین فرمائی، ان اوراق میں دو ایک جگہ عبارت چھوٹی ہوئی تھی آپ نے استفسار فرمایا میں نے عرض کیا کہ ان فوائد کا بقیہ میری سمجھ میں اچھی طرح نہ آیا تھا اس لئے جگہ چھوڑ دی کہ آپ سے دریافت کر کے لکھوں گا آپ بہت مسرور ہوئے اور عبارت کو درست فرمایا۔ فوائد الفواد ایک مکمل دستور حیات بھی ہے اس میں تصوف کے جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور حضرت شیخ قدس سرہ نے ان پر گفتگو فرمائی ہے ان میں چند حسب ذیل ہیں:۔

نگاہداشت ادب پیر، سخن در تزکیہ، جد واجتہاد، طاعت مشائخ، ترک وتجرید، اصل سلوک، تحقیق ترک دنیا، آداب تصوف، اشارات مشائخ واصطلاحات ایشان، اثر صحبت، مرتبہ اصحاب صحو، قبول نفس، سخن در ولایت، سخن در سلوک، مکارم اخلاق درویشان، سخن در خطرہ عزیمت وفعل، سخن در بخشش پیر وقابلیت مرید، در معاملات فقراء، سخن در ترک مخالطت خلق، صبر ورضا، قبول کردن فتوح، در حسن عقیدہ مریداں ورعایت کلام پیراں، تحمل، فضیلت روزہ، در قرأت قرآن مجید،

توبہ، کشف وکرامات ومذمت حسد وغیرہ۔

فوائد الفواد کے سات نسخے میری نظر سے گزرے مگر کوئی بھی نسخہ (۳۰۰) تین سو سال سے زائد قدیم اب تک نہیں دیکھا۔ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری میں بھی ایک اچھا نسخہ سرجارام سیالکوٹی ہندو کاتب کا لکھا ہوا ہے اور صاف وعمدہ ہے۔ اس کتاب کا متن بھی میرے علم میں تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ شمس بریلوی صاحب کا اردو ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔ دوسرا نہایت سلیس اور رواں اور عام فہم ترجمہ ہمارے محترم ومعظم حضرت خواجہ سید حسن ثانی نظامی دہلوی مدظلہ العالی نے فرمایا جو مع اصل متن کے ۱۹۹۰ء سے برابر شائع ہو رہا ہے جو ترجمہ کی مقبولیت اور حضرت محبوب الٰہی کی تعلیمات کی معنویت واہمیت کی بین دلیل ہے۔ فوائد الفواد کی قدر ومنزلت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی جیسے غیر معمولی، عبقری اور حضرت محبوب الٰہی کی بارگاہ میں مقرب ترین شخص نے یہ تمنا کی کہ کاش میری تمام تالیفات امیر حسن کے نام سے منسوب ہو جاتیں اور ان کے عوض میں فوائد الفواد میرے نام سے منسوب ہو جاتی، حالاں کہ اس تمنا میں حضرت امیر خسرو کی وہ الفت ومحبت اور غیر معمولی عشق بھی پوشیدہ ہے جو ان کو حضرت محبوب الٰہی سے تھا۔

ابتداء کتاب میں فرماتے ہیں:۔ یکشنبہ ۳ شعبان ۷۰۷ھ کو بندۂ گنہ گار امید وار حسن علا سجزی کو جو ان معانی کو یکجا کرنے والا ہے اس شاہ فلک جاہ فلک دستگاہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا اور اس وقت اس قطب آفتاب ضمیر کی نظروں میں معزز ہوا اور ناصیۂ اصفیا حضرت محبوب الٰہی کی بارگاہ سے چار تر کی کلاہ عنایت ہوئی۔ الحمد الله علیٰ ذالك

آغاز بیان وجہ تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں:۔ خواجہ راسنین ملک الفقراء والمساکین شیخ نظام الحق و الشرع والہدیٰ والدین (اللہ تعالیٰ انہیں سلامت اور ان کی ذات سے مسلمانوں کو مستفیض فرمائے) کے نہاں خانۂ یقین کے خزانے سے یہ غیبی جواہرات اور لاریب پھول جمع کئے گئے ہیں یعنی میں نے جو آپ کی زبان مبارک سے سنا خواہ بعینہ ان ہی الفاظ میں یا ان کا مطلب کسی اور عبارت میں اپنی فہم کے مطابق لکھ لیا اور چوں کہ اس مجموعہ سے شکستہ دلوں کو فائدہ پہونچتا ہے اس لئے اس کا نام فوائد الفواد رکھا۔

چوتھی جلد کے آغاز میں پھر فرماتے ہیں:۔ این سطور اوراق نوروایں حروف الواح سرور بتجدید جمع کردہ انداز کلمات کاملہ و اشارات شاملہ، خواجہ بندہ نواز سلطان دار الملك راز، ملك المشائخ علی الاطلاق قطب الاقطاب عالم باالاتفاق نظام الحق والہدی والدین متع الله المسلمین بطول بقایئه آمین از آغاز محرم سنته اربع عشره وسبعمائته۔

قطعہ:۔

لفظ متین خواجه راحبل متین گرفته ام — کس نرہد زچاه غم جز بسعی ایں رسن
گفته شیخ کرده جمع و امید آں که حق — در گذر اند از کرم گفته و کسرده حسن

(خواجہ بندہ نواز، سلطان دار الملک راز، ملک المشائخ علی الاطلاق، قطب الاقطاب عالم، بالاتفاق، نظام الحق و

الہدی والدین، اللہ تعالی ان کی عمر دراز کرے اور ان سے مسلمانوں کو مستفید فرمائے، ان کے کلمات کاملہ اور ارشادات شاملہ سے اوراق نور کی بہ سطور اور الواح سرور کے حروف ایک دفعہ پھر یکجا کئے جا رہے ہیں ان کا آغاز محرم ۱۴۱۷ھ سے ہوتا ہے۔ میں نے خواجہ کے لفظ متین کو حبل المتین کی طرح تھام لیا ہے کیونکہ غم کے کنویں سے اس رسی کے سہارے کے بغیر کوئی باہر نکل نہیں سکتا۔ شیخ کے ارشادات کو میں نے اس امید کے ساتھ جمع کیا ہے کہ حق تعالی ان کے طفیل میں اپنے کرم سے میرے قول وفعل سے درگذر فرمائے گا)

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا کہ فوائد الفواد مریدین وسالکین راہ طریقت کی لئے ایک لائحہ عمل ہے جس میں عملی ونظری تصوف، آداب صوفیہ و صافیہ، تزکیہ نفس، تصفیہ باطن، سماع، تفسیر، حدیث فقہ، اصول فقہ، تاریخ، لغت جیسے بکثرت مباحث مندرج ہیں جن سے ایک طرف صاحبان نسبت توفیق الٰہی سے حظ وافر اٹھائے رہے ہیں تو دوسری طرف حضرت محبوب الٰہی کی دلنواز وہمہ گیر شخصیت کے بہت سے گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی رہی ہے۔

یہاں پر چند واقعات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کی مدد سے حضرت محبوب الٰہی کی شخصیت کا مزید عرفان ہوتا ہے۔ مثلاً حضرات صوفیہ کے یہاں تمام تر زار ادب اور اس کی رعایت پر ہے اس کی دلنشین تعلیم کے سلسلے میں ایک روز ایک قصہ بیان کیا حضرت جنید بغدادیؒ ایک مرتبہ عید کی رات اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تے تھے، مردان غیب میں چار افراد حاضر تھے آپ نے باری باری سب سے دریافت فرمایا کہ تم نماز کہاں پڑھو گے ایک نے عرض کیا مکہ معظّمہ میں دوسرے نے بھی یہی جواب دیا تیسرے نے کہا بیت المقدس میں مگر چوتھے نے عرض کیا کہ میں تو بغداد میں آپ کے ہمراہ نماز پڑھوں گا جس پر انہوں نے فرمایا تم سب سے زیادہ زاہد وعالم وفاضل ہو۔

جلد اول ۳۲ ویں مجلس میں فرماتے ہیں کہ ادب یہ ہے کہ جو بھی مجلس میں آئے جہاں خالی جگہ پائے وہیں بیٹھ جائے اگر جگہ نہ ہو تو حلقے کے پیچھے بیٹھے نہ کہ لوگوں کے کاندھے پھلانگتا ہوا بیچ میں جا بیٹھے کیوں کہ ایسے شخص پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔ بندگان خدا کی حاجت روائی، خدمت خلق اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کی فضیلت واہمیت کلام الٰہی اور ارشادات نبوی ﷺ سے ثابت ہے حضرت محبوب الٰہیؒ قولاً وفعلاً اس کی تاکید فرماتے اور مختلف واقعات وقصص کے ذریعے اسکی اہمیت ذہن نشین فرماتے تھے۔ ایک روز فرمایا کہ خواجہ علی فرزند خواجہ بزرگ شیخ رکن الدین اللہ تعالی ان سب کو خیر کے ساتھ حشر میں اٹھائے تاتاری کافروں کے حملے میں گرفتار ہوئے چنگیز خان کے سامنے لے جائے گئے اسی خاندان کے مریدوں میں ایک صاحب وہاں موجود تھے اور دربار میں اثر ورسوخ والے تھے جب خواجہ کو گرفتار دیکھا تو پریشان ہوئے دل میں ان کی رہائی کی صورت تلاش کرنے لگے اور چنگیز کے سامنے جا کر کہا کہ اس شخص کے پاس بہت بزرگ تھے بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے، چنگیز نے پوچھا صرف اپنے لوگوں کو یا دوسروں کو بھی کہا اپنوں کو تو سبھی کھلاتے ہیں غیروں کو بھی کھلاتے تھے، چنگیز اس بات سے بہت خوش ہوا کہ وہ کیسا نیک ہوتا ہے جو مخلوق خدا کو کھانا کھلاتا ہے، اسی وقت حکم دیا کہ انہیں رہا کر دیں، معذرت اور خلعت بخشی۔ (جلد اول مجلس ۱۷) ایک مرتبہ فرمایا درویشی یہ ہے کہ جو آنے والا آئے سلام کے بعد اس کے سامنے کھانا رکھا جائے اور پھر بات چیت میں مشغول ہو کہ اول سلام پھر طعام بعدہٗ کلام (جلد اول مجلس ۲۸) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خود

دوسروں سے پہلے کھانے کی ابتداء نہیں کرنی چاہئے یعنی اگر دسترخوان لگا ہے اور کھلانے والا موجود ہے اور اس نے مہمان سے پہلے شروع کرلیا تو یہ مذموم اور برا (جلد۴ مجلس ۳) ایک روز کھانا کھلانے اور جو کچھ میسر ہو مہمان کے سامنے رکھ دینے اور خاطر تواضع کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ حدیث شریف ہے ''من زار حیا ولم یذق منہ شیئا فکانما زار میتا'' یعنی جس نے کسی زندہ آدمی سے ملاقات کی اور اس کے یہاں کچھ نہ چکھا تو گویا اس نے مردے سے ملاقات کی۔

حضرت شیخ بدرالدین غزنویؒ کے بارے میں ہے کہ اگر ان کے پاس کچھ نہ ہوتا تو کہتے کہ پانی ہی پیش کردیں (جلد۴ مجلس ۱۶)۔ نیز ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ کا قول ہے کہ ایک درم کھانا تیار کرا کے رفیقوں کے سامنے رکھنا ۲۰ درم صدقہ کرنے سے بہتر ہے (جلد اول مجلس ۱۶) انفاق مال کے سلسلے میں یہ فرمایا کہ زر و جواہر اور سونے چاندی کی راحت ان کو خرچ کرنے میں ہے یعنی آدمی کا مقصد سونے چاندی کے جمع کرنے سے صرف یہ ہونا چاہیے کہ ان سے دوسروں کو فائدہ پہونچے (جلد۲ مجلس ۶)۔ صبر و رضا اور توکل اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتے ہیں۔ آفات و بلاؤں پر صبر انبیاء علیہم السلام وصدیقین و کاملین کی صفت ہے۔ ارباب تصوف نے ان تینوں خوبیوں کو اپنی ذات میں رچانے بسانے پر زور دیا۔ حضرت محبوب الٰہی نے ایک روز فرمایا کہ صبر یہ ہے کہ جب بندے کو کوئی ناگوار بات پیش آئے تو اس پر صبر کرے اور شکوہ و شکایت نہ کرے اور رضا یہ ہے کہ جب کسی ناپسندیدہ بات سے سابقہ پڑے تو اس سے بھی اس کو ناگواری نہ ہو گویا کہ بلا سے سابقہ ہی نہ پڑا ہو۔ بقول حضرت بیدم شاہ وارثیؒ:۔

عشاق کا شیوہ ہے راضی برضا رہنا　　وہ کچھ بھی کریں بیدم رحم انکا عتاب ان کا

ایک اور قصہ اسی ضمن میں ارشاد فرمایا کہ ایک شہر میں ایک بہت مالدار برہمن رہتا تھا حاکم وقت نے اس کا سارا مال اسباب ضبط کرلیا اور اسے بالکل مفلس اور کنگال کردیا۔ ایک روز وہ کہیں جارہا تھا اسکا دوست ملا اس سے حال پوچھا اس نے کہا بہت اچھا ہے مزہ ہے، دوست نے کہا تیری ساری چیزیں تو تجھ سے چھن گئیں مزہ کہاں سے آیا کہنے لگا میرا زنار (جینو) تو میرے پاس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر سب کچھ چھن جائے تو پرواہ نہیں حضرت حق کی محبت برقرار رہنی چاہئے۔ تواضع اور انکساری، فروتنی اور عاجزی اہل کمال کی نشانیوں میں سے ہیں اپنے آپ کو دوسروں سے کمتر سمجھنا چاہئے اسی میں دنیا کی صلاح وفلاح پوشیدہ ہے۔ جد محترم حضرت مولانی شاہ تراب علی قلندر کا کوروی فرماتے ہیں:۔

تو اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھے جا　　یہی تو دیکھتے ہیں ہم بڑا کمال تیرا

ایک روز اور ارشاد فرمایا کہ جسے بھی دیکھے اپنے سے بہتر خیال کرے خواہ وہ خود اطاعت گذار ہو اور وہ گناہ گار ہو کیوں کہ عین ممکن ہے کہ اس کی اطاعت اطاعتوں میں آخری اطاعت ہو اور اس کا گناہ گناہوں میں آخری گناہ۔ فرمایا کہ گناہ گار گناہ کرتے وقت تین حیثیتوں سے اللہ کا اطاعت گذار ہوتا ہے، ایک تو یہ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ جائز نہیں ہے، دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور تیسرے یہ لہ اس کو مغفرت و بخشش کی آس بھی لگی رہتی ہے اور یہ تینوں عقیدے اطاعت گذار کے کام ہیں (جلد۲ مجلس ۲۳)۔ حضرت شیخ ژسن بصری فرماتے ہیں کہ میں نے جس کسی کو دیکھا اپنے سے بہتر سمجھا سوائی ایک بار مگر اس کی سزا بھی مجھے ملی۔ حلم و بردباری بھی انسانیت کی اعلی اقدار ہیں، فوائد الفواد میں

متعدد حکایات اوران کے ضمن میں آپکے ارشادات درج ہیں جن سے ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے:۔

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر　　بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

(حلم و بردباری کی تلوار اپنی کاٹ میں سیکڑوں فتحیاب لشکروں سے بھی موثر اور تیز ہوتی ہے)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حلم کا بیان فرمایا کہ کسی اوباس نے آپ سے بدکلامی کی اور عیب لگا کر سخت وسست کہا ،آپ نے فرمایا جناب جو بہت سے عیب مجھ میں ہیں آپ ان میں سے ایک بہت معمولی چیز کا پتہ لگا سکے ہیں۔تحمل کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ مخلوق کا معاملہ تین قسم کا ہے پہلی قسم یہ کہ آدمی سے نہ تو کسی کو فائدہ پہونچے نہ نقصان، ایسے لوگوں کا حال پتھروں جیسا ہے، دوسری قسم وہ ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہونچتا ہے نقصان نہیں یہ تھوڑا بہتر ہے، تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن سے دوسروں کو فائدہ تو پہونچتا ہی ہے لیکن اگر ان کو کوئی نقصان پہونچاتا ہے تو اس کا بدلہ نہیں لیتے اور برداشت سے کام لیتے ہیں یہ صدیقوں کا کام ہے اور یہ لوگ سب سے بہتر ہیں (جلد پنجم مجلس ۱۳)۔ایک مرتبہ تحمل و بردباری کے سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ جو جفا کو برداشت کر لیتا ہے وہ سب سے اچھا ہے غصہ کو پی جانا چاہئے اور بدلہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے اسی ضمن میں حضرت محبوب الٰہی اکثر ان اشعار کو پڑھا کرتے تھے:۔

ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد　　ہر کہ مار ارنجہ دارد راحتش بسیار باد

ہر کہ او خاری نہد در راہ ما از دشمنی　　ہر گلی کز باغ عمرش بی خار باد

(جو ہمارا دوست نہ بنے اللہ اس کا دوست رہے۔جو ہمیں تکلیف پہونچائے اس کو خوب آرام ملے جو بھی دشمنی سے ہماری راہ میں کانٹا رکھے اس کی زندگی کے چمن کے ہر پھول بغیر کانٹے کا کھلے)۔مزید فرمایا کہ عوام کا یہ حال ہے کہ اچھوں کا ساتھ اچھائی اور بروں کے ساتھ برائی کرتے ہیں لیکن فقیروں کا طریقہ یہ ہے کہ اچھوں کے ساتھ اچھے اور بروں کے ساتھ بھی اچھے رہتے ہیں (جلد دوم مجلس ۳۵)۔　　فوائد الفود کا ادبی کا پایہ بھی نہایت بلند ہے جامع ملفوظ نے حضرت شیخ قدس سرہ کی زبان مبارک سے سن کر بھی اشعار نقل کئے ہیں اور خود مولف کے اشعار بھی جابجا ہیں، فوائد الفواد کا سن تکمیل و اختتام ۷۲۲ھ ہے یہ تاریخ ان اشعار سے صاف معلوم ہوتی ہے:۔

چوں بہ ہفصد فزودبست ودو سال　　بیستم روز از مہ شعبان

ازاشارات خواجہ جمع آمد　　این بشارت دہ فتوح جہان

شیخ ما چوں محمد آمد نام　　حسن اندر ثنائے او حسان

۲۰ شعبان ۷۲۲ھ کو حضرت خواجہ کے یہ اشارات جو کہ تمام عالم کے خشود کی بشارت ہیں میں نے جمع کئے اور چوں کہ ہمارے شیخ (حضرت محبوب الٰہی) کا اسم گرامی بھی محمد ہے اس واسطے حسن (سجزی) آپ کی مدح میں ایسے ہیں جیسے حسان بن ثابتؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں تھے۔فوائد الفواد نہ صرف حیات انسانی کو زندہ جاوید بنانے میں خاص اہمیت کی حامل ہے بلکہ اپنے مولفؒ کے نام و کام کو بھی بقائے دوام عطا کرنے کیلئے کافی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

میرزا اکمل الدین حیات اور کارنامے

سرفراز احمد،
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

عہد مغلیہ کو فارسی زبان و ادب کی پیشرفت، ترویج و ترقی کے اعتبار سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس عہد حکومت میں ہندوستان میں دیگر فارسی ادب کے مراکز کی طرح خطۂ کشمیر کو بھی فارسی ادب کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں پر ایسے نامور فارسی شعراء و ادباء منظر عام پر آئے جنہوں نے فارسی ادب کے دیگر موضوعات کے علاوہ تصوّف و عرفان کے دامن کو بھی وسعت بخشی ہے۔ ایسا ہی ایک نام میرزا اکمل الدین کا بھی ہے۔

آپ کا پورا نام میرزا اکمل الدین محمد کامل بیگ خان بدخشی ہے۔ آپ کے آباواجداد نے تاشقند سے ہجرت کر کے کچھ عرصہ تک بدخشان میں سکونت اختیا کی تھی۔ اسی مناسبت سے میرزا کامل کے نام کے ساتھ لفظ بدخشی پیوست ہے۔(۱) میرزا اکمل الدین کے جد امجد ملک محمد خان مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ اقتدار میں بدخشان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہ نے ان کی علمی استعداد اور فوجی قابلیت دیکھ کر انہیں محمد قلی خان کے خطاب سے نوازنے کے علاوہ ۱۵۹۰ء میں کشمیر کا گورنر بھی مقرر کیا۔(۲) ملک محمد خان نے کشمیر ہی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ میرزا اکمل الدین کے والد میرزا عادل بیگ خان کا شمار مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے مصاحبان خاص میں ہوتا تھا۔ بادشاہ نے انہیں امیرالامراء کا رتبہ عطا کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اکثر اوقات شاہی محلات ہی میں قیام کرتے تھے۔(۳) میرزا کامل کی ولادت ۱۰۵۴ء میں کشمیر میں ہوئی ان دنوں بادشاہ کشمیر ہی میں تھا۔ بادشاہ نے اس نومولود بچے کا نام کامل رکھا۔ جس کا ذکر خود میرزا کامل نے قصیدہ 'مخزالاسرار' میں یوں کیا ہے:

کاملم شاہجہان نام نہاد است آن روز که اندرین دارفنا کرد خدا میلادم(۴)

میرزا کامل بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک والدہ نے ان کی پرورش کی اور پھر مرشد کامل خواجہ حبیب اللہ عطار نے انکی تعلیم و تربیت کی۔ سات سال کی عمر میں انہوں نے مروجہ تعلیم حاصل کی، عربی اور فارسی کی تعلیم انہوں نے اپنے وقت کے ممتاز عالم دین مولانا ابوالفتح کلو سے حاصل کی۔(۵) بارہ سال کی عمر میں آپ مرشد کامل خواجہ حبیب اللہ عطار کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے بچپن ہی سے میرزا کامل کو تلاش حق اور معرفت الٰہی کی جستجو دامن گیر رہتی تھی۔ ان کی یہ تشنگی خواجہ حبیب اللہ کی خدمت میں پہنچ کر ختم ہوئی۔ جس کا ذکر میرزا کامل اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں:

چند سالی زمیان رفت و شدم طالب پیر حکم تقدیر به سوئے در او راه دادم (۶)

انہوں نے تیرہ سال کی عمر میں باضابطہ خواجہ حبیب اللہ کے دست مبارک پر بیعت کی اور روحانی پیاس بجھانے

لگے، سیر وسلوک کی منازل طے کیں۔ ساتھ ہی ریاضت شاقہ ،مجوعبادت الٰہی، بیداری شب اور تزکیہ نفس ان کے روز کے مشاغل میں شامل تھے۔ جس کی طرف وہ قصیدہ میں اشارہ کرتے ہیں:

صوم داؤدی و بیداری شبهای دراز
تا بحدیکه ز وساوس جگر پادادم
مرگ می جستم از انحالت و ازجان شده سیر
تا دو سه سال چنین بود که هست آن یادم
شیخ می گفت این است عمل در ناسوت
باش مردانه چو من پیشرو و استادم(۷)

پچیس سال کی عمر میں مرشد کامل نے انہیں اکمل الدین کے لقب سے نوازا۔ اور ساتھ ہی مسند ارشاد سے نواز کر خلافت کی خلعت بھی پہنائی۔ جس کا ذکر انہوں نے قصیدہ میں اس طرح کیا ہے:

اکمل الدین لقبم کرد از احسان مرشد
چون که بسیار بخاك در او افتادم
شیخ من مرشد دین شیخ حبیب الله است
گفت او خرقهٔ دین حضرت قاسم دادم
خرقه بخشید مرا حضرت ایشان زکرم
بهر ارشاد به هر سلسله رخصت دادم (۸)

اس عنایت کے بعد میرزا کامؔل لوگوں کو راہ سلوک اور عرفان پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ شعر گوئی کے لئے بھی ان کی طبیعت موزوں تھی۔ فی البدیہ شعر کہتے تھے۔ آپ کا سارا کلام تصوف وعرفان کے تابناک موتیوں سے لبریز ہے۔ کشمیر میں آپ کو مولانا رومؔ کا مقام حاصل ہے۔ جس کا ذکر مؤلف پارسی سرایان کشمیر اس طرح کرتے ہیں:

"او از لحاظ شعرت فارسی در کشمیر مقام مولاناجلال الدین بلخی را دارد" (۹)

میرزا کامؔل نے ۱۱۳۱ء میں وفات پائی۔ اور اپنے قیام گاہ کے نزدیک محلّہ حول سرینگر میں سپرد خاک ہوئے ان کی تربت پر یہ شعر کندہ ہے:

ای کامل اکمل مقدس تاریخ تو حاتم کمل بس (۱۰)

میرزا کامل کے مریدوں کا سلسلہ نہ صرف سرزمین کشمیر ہی میں بلکہ ہندوستان میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ جن میں عبدالسلام قلندر، میرزا فرہاد بیگ، مورخ واقعات کشمیر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، اور صاحب فتحات الکبرویہ خواجہ عبدالوہاب نوری قابل ذکر ہیں۔

ادبی خدمات:

میرزا اکمل الدین نے نہ صرف تمام اصناف سخن شعر فارسی میں طبع آزمائی کی ہے بلکہ وہ ہر اصناف سخن میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں قصیدہ، مثنوی، رباعیات اور غزلیات شامل ہیں۔ قصیدہ 'مخبرالاسرار' کے نام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قصید راہ سلوک کے راز و نیاز سے متعلق ہے۔ یہ ۲۷۹ (دوسواناسی) اشعار پر مشتمل ہے۔ صاحب تحفۂ اکملیہ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میرزا کامل کے مرید نے ان سے دریافت کیا کہ سلسلۂ کبرویہ میں کتنے واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ جوں ہی انہوں نے سائل کو جواب دینے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کے مرشد ان پر جلوہ گر ہوئے اور فرمایا کہ نظم کی صورت میں بیان کرو جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

"روزی شخصی از ایشان التماس کرد که بچند واسطه با حضرت رسول مقبول صلی الله علیه وسلم اتصال دارند۔ که نسبت ارباب طریق بیان کنند فی الحال روح ذی فتوح حضرت خواجه جلوه گر شده با ایشان فرمودند که چرا در قانون نظم جوابش نگوئی"(۱۱)

اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیّن ہونے اور شب معراج کا مدلل تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ شب معراج میں خدا تعالیٰ نے اپنے قرب سے نوازا اور تمام زمین و آسمان کو ان کے لئے آراستہ کیا۔ دراصل اس کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد پیغمبر اسلام کا وجود مبارک ہی تھا۔ جن کے وسیلہ سے تمام پوشیدہ خزانوں کو عیاں کر دیا گیا۔ اگر ان کی تخلیق مقصود نہ ہوتی تو بنی آدم کا وجود بھی نہ ہوتا۔ خدا نے آپؐ کا مقام و مرتبہ اتنا بلند عطا فرمایا کہ اکثر انبیا اکرامؑ نے آپؐ کے امتی ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

مصطفیٰ رحمت عالم که بود شاهد ما
بهر او گنج نهانِ دو جهان بگشادم
اوست مقصود ازاین جمله که پیدا کردم
گر نمی بودنمی بود بآدم دادم(۱۲)

مقام ملکوت: مقام ناسوت سے گزرنے کے بعد مقام ملکوت آتا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پر سالک کو معرفت خداوندی کی طرف راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ اس راہ کا طالب سنت محمدیؐ پر عمل پیرا ہو کر نفسانی خواہشات کو ترک کر دیتا ہے۔ ریاضت شاقہ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ طاعت و فرمانبرداری اور ذکر و اذکار اس کے جسم کی روحانیغذا بن جاتی ہے۔ اس راستہ کی دشواریوں میں سالک کو وصال کی لذّت محسوس ہوتی ہے۔ فقر اس راستہ کا فخری لباس ہے۔ اس کو شاعر نے شعر کا جامہ اس طرح سے پہنایا ہے:

تا با اینجا ہمہ ناسوت بود نام مقام　　ملکوت ست ازین پیش کہ بیش افتادم

خلعت فقر کہ فخر است مرا بخشیدند　　چون بخاك در مرشد سر خود بنہادم

مقام جبروت کا ذکر میرزا کامؔل نے نہایت ہی مدلل انداز میں کیا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں پر سالک کو نفسانی خوہشات کو ترک کر دینا پڑتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان اپنی زندگی کی حقیقت سے روشناس ہو جاتا ہے کہ انسان کی زندگی لافانی اور لازوال ہے۔ تب اسے روحانی شادمانی بھی میسر ہوتی ہے۔ میرزا کامؔل فرماتے ہیں کی مجھے اس راستے پر گامزن ہوئے ۳۰ (تیس) سال ہو چکے ہیں۔ اب بھی میں اس کی لذّت محسوس کرتا ہوں۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پر عشق ہی رہبر اور استاد بن جاتا ہے اور انسانی چشم بصیرت برق سے بھی تیز ہو جاتی ہے۔ یہی انسانی روح کی معراج بھی ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے نہایت خوبصورت انداز میں اس طرح کیا ہے:

جبروت است ازین پیش منازل در راہ

گوش دل جانب من کن کہ بشرح افتادم

دید مرشد کہ شدم پختہ و آمادہ بکار

و ز ہمہ قید تعلق زجہان آزادم

ان گاہ گفت کہ بیمرگ نخواہی راہ یافت

در زمان مُردم و مردانہ براہ افتادم(۱۳)

اس قصیدہ میں شاعر کا مقصد صرف عرفان الٰہی اور عشق حقیقی کے مسائل کو بیان کرنا ہے۔ اس میں آغاز سے آخر تک روحانی مسائل اور معرفت حقیقی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں شاعر نے کسی کی مدح گوئی نہیں کی۔ اس کے آخر میں میرزا کامؔل اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتیہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اس قصیدہ کو سیر و سلوک کے راستہ پر چلنے والوں کی رہنمائی کی خاطر اس راستہ کے اسرار و رموز کی منظوم شرح کی ہے:

این قصیدہ کہ بود مخبر الاسرار بنام　　بہر ارشاد مریدانست کہ شرحش دادم(۱۴)

مثنوی بحر العرفان:

مثنوی 'بحرالعرفان' کشمیر میں تصوف اور عرفان پر لکھی جانے والی مثنویوں میں ایک اہم اور عریض بحر کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے لئے اس مختصر سے مقالہ میں اس کا ذکر کرنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ مختصر یہ کہ مثنوی 'بحرالعرفان' کو رشتہ تحریر میں لانے کے لئے میرزا کامل نے اپنے پیشرو عرفانی اساتذہ کی شاہکار تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ان میں شیخ عطار کی 'منطق الطیر'، مولانا جلال الدین رومی کی 'مثنوی معنوی'، نظامی گنجوی کا پنج گنج، امیر خسرو دہلوی اور مولانا جامی کی مثنویات کے علاوہ غزلیات حافظ شیرازی شامل ہیں۔ ان اساتذہ سخن کا تذکرہ انہوں نے نہایت عقیدت سے اپنے اشعار میں بھی جا بجا کیا ہے۔ مثنوی مذکور کی ابتدا میں خداوند بزرگوار کی جملہ صفات کو بیان کیا ہے کہ وہی ہر ایک چیز پر قادر ہے کائنات کی ہر چیز اسی کی محتاج ہے اور اسی کے نور سے اس کائنات کا ہر ذرّہ منوّر ہے۔ سب تعریفیں اسی کے لائق ہیں۔ اس کا ذکر میرزا کامل اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں:

حمد الله حامد و محمود　　قوت وفعل خویش را معبود

از جمال و جلال خود مشحون　　از ازل تا ابد بخود مصون

جلوه گر ذاتش از صفات شده　　صفتش و جلوه ساز ذات شده

جلوه هایش ز صنع همدیگر　　سوی آن جلوه گر شده رهبر (۱۵)

حمد باری تعالیٰ کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کی شان مبارک کا تذکرہ کیا ہے کہ وہی اس کائنات میں رنگ و بو کا سبب ہیں۔ اگر آپؐ کی خلقت مقصود نہ ہوتی تو یہ جہان بھی بے کیف ہوتا۔ دراصل آپؐ کا وجود مبارک ہی اس کائنات کی تخلیق کا مظہر ہے اور پیغمبر اسلام تمام جہاں کے لئے باعث فخر اور رحمت ہیں۔ اس کو انہوں نے اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

چون جمالش به جلوهٔ نور افراشت　　خلقت زبدهٔ رسلؐ انباشت

منبع هر چه هست نورش شد　　ذات حق ظاهر از ظهورش شد

مثنوی 'بحرالعرفان' کی اہمیت وافادیت کے بارے میں صاحب مثنوی لکھتے ہیں کہ یہ مثنوی 'بحرالعرفان' صوفیاء اکرام کے راز و نیاز سے متعلق ہے۔ اور اس کا ہر ایک لفظ صدف کے مانند ہے۔ اور اسکے معنی موتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو کوئی بھی ان موتیوں کا طالب ہوگا اسے اس مثنوی کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ جو شخص راہ سلوک پر گامزن ہو کر عشق و معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کو پڑھے۔ خوش بخت ہوگا وہ شخص جسے یہ موتی حاصل ہونگے۔ خود مصنف نے اس دریائے بیکران میں غوطہ زن ہو کر اس راہ کے طالبوں کے لئے موتی پیدا کیے ہیں جس کی طرف انہوں نے یوں اشارہ کیا ہے:

بحرالعرفان که اکمل الدین گفت　　اندر اسرار صوفیه دُرسفت

لفـظ او چـون صـدف معنی درُ ایـن کتابیست بحر ز آن درُ پر

آنـکه طالـب بـه درُ شاہواراست خواندن این کتاب در کار است(۱۶)

مختصر یہ کہ مثنوی 'بحرالعرفان' عشق ومعرفت کا بحر بیکراں ہے۔جس قدر بھی قاری اس میں غوطہ زن ہوگا اسی قدر اسے تابناک موتی حاصل ہونگے۔

نظم بدیع:

نظم بدیع عربی قصیدہ 'بانت سعد' کی منظوم شرح ہے۔اس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا ہے۔

حـمد پـرور دگـار انس و جان را ہر زمان کو پدید آورد از قدرت زمین و آسمان

ہر کس باید کہ گوید حمد او بیگاہ و گاہ گر چہ نتوان گفت لایق آن پادشاہ (۱۷)

حمد پروردگار کے بعد سرکار دوعالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آل محمدؐ اور اصحاب اکرام پر درود وسلام کا نظرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

احـــــمد مـــرسل امـــام انبیـــاختـــم رسـل

مـقتـداد انـــس و جـــان مـقـصـود خـلـق خـود کـل

ہــر زمـــان از حـضـرت حـق صـد صـلـواة و صـد سـلام

بــــاونـازل بــــروی بـــر آل و اصـــحاب کرام(۱۸)

میرزا کاملؔ اس قصیدہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا پڑھنا اس لئے بھی اہم ہے۔کیونکہ یہ مدح محبوب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔اور اگر اس کو تعویذ جان اور قلب کی تسکین کا ذریعہ بھی قرار دیں تو بھی درست ہے۔اس میں پیغمبر اسلام کے اوصاف کا اجمال واختصار سے ذکر کیا گیا ہے۔اس کو انہوں نے شعر کے قالب میں اس انداز سے پیش کیا ہے:

خـوانـدن آن امده لازم بہر شاہ و گدا ز انکہ اوہست مشتمل بر نعت محبوب خدا

نامش ار تعویز جان گویند آنہم جائیز وصـفش ار قـوت روان گـویند آنـہم جائیز

کـارہای خویش را یکچند بگزاریم ما بـــہر ایـــشان بـر قصیدہ شرح بنگاریم(۱۹)

نظم بدیع کو میرزا کاملؔ نے ۱۱۲۶ھ میں منظوم کیا ہے۔اور اس کے اشعار کی تعداد ۱۳۳۹ ہے۔جس کا ذکر انہوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے:

نظم دلجو را چو بشماری و آری در قلم

یك هزار وسی و سه ونه یابی نه ز ان بیش و نه کم

اس نظم کے اختتام پر میرزا کامل نے حمد خداوند تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ اسی کے فضل وکرم سے اس نظم کو پایان تک پہنچانے میں مدد ملی۔ اپنے ان خیالات کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

مر خدا را صد ثنا کز لطفش این نظم لطیف

شد تمام و ہم قوی ز و شاد مان شد ز ضعیف

این کاسه دلجو بہنگام ہمایون بر دمید

این نہال نغز و نازك رست در وقت سعید

گفت کو تا کئی کنی تا چند گوئی کامل

راه قیل و قال را تا چند پوئی عامل(۲۰)

اس کے علاوہ میرزا کامل نے دو بیتی بھی کہی ہیں۔ جو ان کے عشق حقیقی کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شاعر مذکور کے دل میں عشق اس قدر سرایت کر چکا تھا۔ اس میں دنیاوی شادمانی، یا غم سمانے کی گنجایش ہی نہیں تھی۔ میرزا اکمل الدین ایک صوفی منش عارف اور عالم دین شاعر تھے۔ ان کا پورا کلام عشق حقیقی سے لبریز ہے۔ اور راہ سلوک کے پیروکاروں کیلئے مشغل راہ ہے۔

حواشی:

(۱)۔فتحات الکبرویہ، از عبدالوہاب نوری،ص/ ۲۶۔نسخہ خطی زیر شمارہ ۸۲،۵۰، ریسرچ لائبریری کشمیر یونیورسٹی۔ (۲)۔کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، از عبدالقادر سروری ،ص/۱۷۳۔سرینگر ۱۹۶۸ء۔(۳)۔تحفہ اکملیہ، از محمد حسن بن حافظ،ص/۳۶، لاہور ۱۳۵۰ھ۔(۴)۔قصیدہ مخبرالاسرار، از میرزا اکمل الدین ،ص/۶، نسخہ خطی زیر شمارہ ۶۰۹۔ (۵)۔تحفہ اکملیہ ص۳۷۔(۶)۔قصیدہ مخبرالاسرار ص۷۔(۷)۔قصیدہ مخبرالاسرار ص۴۔(۸)۔قصیدہ مخبرالاسرار ص۸۔(۹)۔پارسی سرایان کشمیر، دکتر، گ ل۔تیکو،ص/۵۶۔انجمن ایران و ہند۔۱۳۴۲۔(۱۰)۔کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ ص۱۷۳۔(۱۱)۔تحفہ اکملیہ ص۴۱۔(۱۲)۔ایضاً ص۳۔(۱۳)۔ایضاً ص۱۱۔(۱۴)۔ایضاً ص۱۳۔(۱۵)۔مثنوی بحرالعرفان جلد۱ ص۱۲۔(۱۶)۔مثنوی بحرالعرفان جلد۲ ص۹۰ ب۔(۱۷)۔نظم بدیع، از میرزا اکمل الدین بدخشی۔ ص/۱، نسخہ خطی محکمہ تحقیق واشاعت حکومت جموں وکشمیر زیر شمارہ ۲۸۳۶۔(۱۸)۔ایضاً ص۳۔۲۱۔ایضاً ص۲۔(۱۹)۔ایضاً ص۳۷۔(۲۰)۔تاریخ حسن، از پیر غلام حسن کھویامی، جلد سوم ص/۲۶۴، محکمہ تحقیق واشاعت حکومت جموں وکشمیر۔

میر واحد بلگرامی اور تصوف

محمد عمر
ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی وفارسی،
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ہندوستان میں پورب کی زمین کو جو علمی مرتبہ حاصل رہا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ یہاں کے جو شہر تھے وہ علمی درسگاہیں تو تھیں ہی لیکن سرزمین اودھ کے جو قصبات تھے کاکوری، سندیلہ، موہان خیرآباد، مبارک پور، بلگرام وغیرہ یہاں بھی علم وفضل، درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ قصبہ بلگرام کی زمین علم وفضل، شعروادب، معرفت وسلوک کے اعتبار سے بہت زرخیز علاقہ رہا ہے۔ یہاں سے علوم وفنون کے ایسے درخشاں ستارے نمودار ہوئے جو علمی دنیا کے آسمان پر یکتا نظر آتے ہیں اور انہی کی وجہ سے بلگرام فضلاء، علماء، مشائخ، اولیاء اللہ مرشدین ومسترشدین کا مرکز ومسکن بنا رہا۔ ان کے علمی، درسی، تدریسی، تصنیفی، تالیفی ہنگاموں سے دور دراز علاقوں کے طلباء اپنی پیاس بجھانے کے لئے جمع ہونے لگے۔ اہل بلگرام بھی ان کی تواضع، اکرام اور خاطر مدارات کو اپنے لئے سعادت دارین سمجھتے اور ان کی خدمت کرتے۔

مؤرخین، مؤلفین، شعرا اور ادباء نے بلگرام کی توصیف میں اشعار کہے۔ علامہ عبدالجلیل بلگرامی بلگرام کی توصیف میں گویا ہیں:

سبحان الله چه بلگرامے — کوثر مئے آفتاب جامے
خاکش گل نو بہار عشق است — آبش مئے بے خمار عشق است
از عشق سرِ شت ایزد پاك — از روز ازل ایں خمیر ایں خاك
ہر گل که دمیده است زایں خاك — خونی جگریست پیرہن چاك (۱)

علامہ عبدالجلیل بلگرامی ہی نے فضلاء وفقراء بلگرام کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار کہے:

از فرقه طالبان مولی — رنگینئی بزم وصف اولی
وحدت نگہاں کثرت آثار — ازبادئه نفی غیر سر شار
اطوار وجود دیده یکرنگ — حیرت بنگاه کرده ہم سنگ
میناں شکنان بزم ہستی — مدہوشِ شراب حق پرستی
دل کرده ز بہر یار خورد فرش — الرحمن استوی علی الفرش (۲)

حضرت عبدالواحد بلگرامی علم وفضل کے وہ سرچشمہ تھے جس سے گلشن شعروادب میں بہار آ گئی اور معارف و سلوک کے وہ روشن ستارہ تھے جس کی روشنی سے ایک عالم منور اور مجلی ہو گیا۔

حضرت بلگرامی ۹۱۲ھ میں دارالعمل میں جلوہ افروز ہوئے، اپنے ہی علاقہ کے علماء کاملین، فضلاء صالحین

سے اکتساب علم کیا جنھوں نے ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، حضرت بلگرامی ہمیشہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز ومیّز رہے۔

عربی ادب کے مشہور تذکرہ نگار صاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحئی تحریر کرتے ہیں:

''احد العلماء المبرزین فی المعارف الالٰهیة ، کان صاحبَ الفضائل العلمیة والکرامات الجلیلة والأذواق الصحیحة والمواجه الصادقة''(۳)

معروف مؤرخ صاحب منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی جو حضرت بلگرامی سے ذاتی طور پر واقف تھے اور حضرت سے ان کی ملاقات بھی تھی۔اس ملاقات کا ذکر علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے فارسی تذکرہ ''مآثر الکرام'' میں کیا ہے، علامہ کا خیال ہے کہ ملا بدایونی کی یہ ملاقات ۹۷۹ھ میں ہوئی ہے جیسا کہ خود صاحب منتخب التواریخ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ بہرحال علامہ بدایونی حضرت بلگرامی کے بارے میں اپنا اظہار رائے یوں پیش کرتے ہیں:

" شیخ عبد الواحد بلگرامی بسیار صاحب فضائل و کمالات و ریاضت وعبادات است واخلاق سَنیة و صفات رضیه دارد ومشرب او عالی است '' (۴)

بلگرام کے نامور محدث، مؤرخ اور ادیب علامہ غلام علی آزاد رقمطراز ہیں:

"قطب فلك ولایت ومرکز دائره ہدایت بود صاحب آیات ظاہره و کرامات باہره بود''(۵)

حضرت بلگرامی نے سلوک ومعرفت کی منزلیں اس دور کے شیخ طریقت شیخ صفی الدین بن عبدالصمد سائی پوری جو کہ خلیفہ تھے شیخ سعدالدین خیرآبادی کے(۶) کی شاگردی میں طے کیں، مرشد باصفا نے حضرت بلگرامی پر خاص توجہ فرمائی لیکن یہ سلسلہ بہت دیر تک نہ چل سکا کیونکہ مرشد شیخ صفی الدین کا ۹۳۳ھ میں انتقال ہوگیا، اس وقت حضرت بلگرامی کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ شیخ صفی الدین کے خلیفہ اجل شیخ حسین (متوفی ۹۷۶) نے حضرت بلگرامی کو اپنے آغوش تربیت میں لے لیا اور خلعہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت بلگرامی کے مزاج میں تواضع وانکساری حد درجہ موجود تھی کہ خرقہ خلافت کے حصول کے بعد بہت دنوں تک سلسلہ بیعت شروع نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ کے مرشد نے اس کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔

حضرت بلگرامی اتباع شریعت کا بہت خیال رکھتے تھے، پوری زندگی رشد وہدایت، تعلیم وتذکیر، اصلاح وتربیت اور تصنیف وتالیف میں گذار دی۔ دنیاوی سرگرمیوں اور اس کے ہنگاموں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ایک مرتبہ بادشاہ وقت سے ملاقات کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی ''مآثر الکرام'' میں تحریر کرتے ہیں:

"چون صیت بزرگی میر عبد الواحد سامعه افروز اکبر بادشاہ گردید ، معتمدی را نزد میر فرستاد و از کمال تمنا درخواست ملاقات نمود ، میر قصد اردوئے معلی کرد و

چوں بدرگاہ سلطانی رسید بادشاہ اعزاز و اکرام تمام بتقدیم رسانید و پانصد بیگھ زمین بطریق سیور غال نیاز کرد'' (۷)

حضرت بلگرامی نے اپنی زندگی ہی میں اس زمین کو اپنی اولاد واحفاد میں تقسیم کردی، چار سو بیگھ اراضی فرزندوں کو اور پچاس بیگھ پوتوں کو دے دی اور پچاس بیگھ خانقاہ کے اخراجات کے لئے متعین کردیا۔ اس سے ان کی دنیا سے لاتعلقی اور بے ثباتی کا حال معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۱۷ھ میں یہ علم وعمل کا پیکر، متبع شریعت وطریقت سو سال سے زائد عمر عزیز گذار کر اپنے آبائی وطن بلگرام میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی اور وہیں پر تدفین بھی عمل میں آئی۔

تصنیف وتالیف حضرت بلگرامی کا خاص مشغلہ تھا، شعروشاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، علم وادب کی مجلسوں میں خوب خوب اشعار کہتے، علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

'' احیانا بر موزونی طبع گوہر قافیہ می سنجید و طلائے خوش عیا رسخن بر می کشید... دیوان غزل موجزے از موجود است و کلاش زمان خود دارد''(۸)

شاعری میں ''شاہدی'' تخلص رکھتے تھے، اور حافظ شیرازی کی تقلید اختیار کی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

''ایں کس در فن تلمیذ خواجہ حافظ شیرازی است قدس سرہ و خواجہ نیز بہ شاگردی خود مرا قبول کردہ و گویا بایں ضعیف ایمائے نمودہ ؎

ہر کہ در طور غزل نکتہ حافظ آموخت یار شیریں سخن نادرہ گفتار من است (۹)

تصنیف وتالیف میں ''تصوف'' خاص موضوع تھا، اس سلسلہ میں آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ علامہ جمال الدین ابوعمرو ابن الحاجب کی معروف نحو کی کتاب ''کافیہ'' جو آج تک مدارس اور علمی اداروں میں داخل نصاب ہے جس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں ہیں ان شرحوں میں ملا جامی کی شرح سب سے زیادہ معروف ومشہور ہے۔ حضرت بلگرامی نے انوکھے انداز میں حقائق اور معارف کی زبان میں شرح تصنیف کی اور اس طرح لکھی کہ سلاست الفاظ اور ربط الفاظ دونوں ہی موجود ہیں۔ متن نحو سے علم ومعرفت کے مسائل کا استنباط کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن الحاجب کی ''کافیہ'' نہیں بلکہ تصوف کے موضوع پر کوئی کتاب ہے۔ حضرت بلگرامی نے یہ شرح اپنے دو عزیز دوستوں شیخ زین الدین اور شیخ جمال الدین کی فرمائش پر کی تھی۔

معارف وسلوک کے طرز پر کافیہ کی دو اور شرح کا ذکر علامہ آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' میں کیا ہے، ان میں سے ایک عربی زبان میں ہے جس کو میر ابوالبقاء جونپوری نے لکھی اور دوسری شرح ملا موہن بہاری نے بزبان فارسی لکھی۔ ملا موہن کا اصل نام ملا محی الدین ابن مولانا عبداللہ ہے، ''موہن'' اور بعض نے ''مومن'' ان کی عرفیت بتلائی ہے، بادشاہ اورنگزیب کے استاذ تھے۔ علامہ آزاد کا بیان ہے کہ انھوں نے ان دونوں شرحوں کو دیکھا ہے۔

حضرت بلگرامی کی تصانیف میں ''سبع سنابل'' بہت معروف ومشہور اور مقبول ہے، یہ تصوف کے موضوع پر ایک

اہم کتاب ہے جس میں معرفت وسلوک، شریعت وطریقت کے بنیادی اور اہم نکات پر مفصل بحث کی گئی ہے، اس کی تحریر اس طرز پر ہے کہ جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ طریقت اور سلوک ومعرفت کے راستہ میں شریعت کی پابندی از حد لازم ہے۔ بغیر شریعت کے طریقت کا تصور اسلام میں نہیں، حضرت بلگرامی نے جب یہ دیکھا کہ مرشدین ومسترشدین اور اس راہ کو اپنانے والے سالکین جو راہ راست سے ہٹ کر شریعت کو چھوڑ کر طریقت میں معرفت الٰہی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں اور معاشرہ میں بددینی اور عقائد میں فساد برپا کر رہے ہیں تو ان کی اصلاح کے لئے کمربستہ ہو گئے اور قلم کو جنبش دی، سبع سنابل میں حضرت بلگرامی تحریر کرتے ہیں:

''اہل بدعت وضلالت طائفہ باشند کہ خود را در لباس اسلام تلبیس پیدا آرند وعقائد فاسدہ خویش در باطن پوشیدہ دارند وبا اہل اسلام بظاہر درآیند وخود را بصورت علمائے محقق بخلق نمایند وہر کجا کہ مجال تصرف یابند تخریب قواعد مسلمانی بافساد عقائد ایمانی بنیاد نہند ودلہائے سادہ پاک را از طہارت فطرت بگردانند....وایں جماعت اعدائے دین واخون الشیاطین وچوں بنور علم علمائے دیں ومشائخ اسلام ظلمات بدعت ایشاں مکشوف می گردد، ناچار علمائے شریعت را دشمن پندارند وعلمائے ربانی کہ نجوم سپہر اسلام اند مردم را از شر ایں شیاطین الانس محفوظ می دارند'' (۱۰)

حضرت بلگرامی نے ''سبع سنابل'' کو سات فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل کو ''سنبلہ'' سے تعبیر کیا ہے، گویا ہر سنبلہ ایک ''بالی'' کے مانند ہے جس میں بہت سے بڑے چھوٹے دانے ہوتے ہیں اسی طرح اس کتاب کے ہر سنبلہ میں شریعت وطریقت کے بہت سی موتیاں موجود ہیں جن میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔

پہلے ''سنبلہ'' میں عقائد ومذاہب سے متعلق اشیاء پر بحث کی گئی ہے جس میں انھوں نے علماء اہل حق کا مذہب فضلا وفقہاء اہل حق کی معتبر کتابوں کی روشنی میں واضح کیا ہے اور ان دوسرے مذاہب کا جن کے خیالات شریعت مطہرہ سے میل نہیں کھاتی ہے ان کا محققانہ رد کر کے قلع قمع کر دیا ہے۔

دوسرے ''سنبلہ'' میں پیری ومریدی، مرشد ومسترشد اور ان کی حقیقت طریقت میں قدم رکھنے کے شرائط نیز ان کے اوصاف، ان کی علامتیں ذکر کی گئی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ طریقت اور شریعت دونوں الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بغیر شریعت کے طریقت کا کوئی اعتبار نہیں، مرشدین اور مسترشدین دونوں کو ہر حال میں شریعت کا پابند اور سنت کا پیروکار رہنا چاہئے۔ اور سالکین کو راہ سلوک اور مقامات معرفت طے کرانے کے دستور اور اصول بتائے ہیں۔

تیسرے ''سنبلہ'' میں ترک دنیا، قناعت، توکل اور زہد کی حقیقت قرآن کریم، احادیث مبارکہ نیز علما، فقہاء اور عارفین کے اقوال وحکایات کے ذریعہ محققانہ طرز پر بہت ہی دلنشین انداز میں دنیا اور سامان دنیا کی مذمت کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بقدر ضرورت دنیا کے حصول کی رغبت بھی دلائی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ کیا مذموم ہے اور کیا محمود ہے۔ ان مثالوں کو بیان کر کے اور ان سے نتائج اخذ کر کے مریدین ومسترشدین کی کردار سازی اور مردم سازی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کتنے اولیاء اللہ اور فضلاء صالحین ہوئے ہیں جو دنیا ہونے کے باوجود دنیا سے بے تعلق وبے رغبت رہے ہیں نیز ان کا برتاؤ اس فانی دنیا کے ساتھ کیسا رہا ہے۔

چوتھے ''سنبلہ'' میں بزرگان دین اولیاء اللہ کے اخلاق کریمانہ، عادات واطوار، عبادات وریاضت، معاملات و معاشرت، صدق واخلاص کا ذکر ہے اوران کے سارے اعمال شریعت مطہرہ اور سنت نبوی کے عین مطابق رہتی ہے، وہ ایک لمحہ بھی اپنی زندگی احکام خداوندی اور سنت رسول سے دور نہیں کرتے ہیں۔

پانچویں ''سنبلہ'' میں خوف اور امید کہ اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب سے خوف میں رہے اور اس کی رحمت وکرم کا امیدوار بھی بنا رہے۔

چھٹے ''سنبلہ'' میں حقائق وحدت معرفت ومحبت جو ایک سالک کو راہ سلوک ومعرفت طے کر لینے اور اخلاق کریمانہ سے متصف ہو جانے کے بعد اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں جس سے سالک کا ظاہر و باطن منور ہو جاتا ہے کا بیان ہے۔

ساتواں ''سنبلہ'' متفرق فوائد کے ذکر میں ہے جس میں حضرت بلگرامی نے اپنے سلسلہ کے بزرگوں کا ذکر کیا ہے اور یہی کتاب کا تتمہ بھی ہے۔

حضرت بلگرامی نے اس کتاب کی تالیف میں اہم کتابوں کی طرف رجوع کیا جس میں سے ''عوارف المعارف''، ''مجمع سلوک'' ، ''سلک السلوک''، ''احیاء العلوم'' ، ''شرح آداب المریدین'' ، ''لب اللباب''، ''مثنوی مولانا روم'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس سے حضرت بلگرامی کی وسعت نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت بلگرامی کی اور بھی تصانیف ہیں مثلاً ''حقائق ہندی'' جس کے مطالعہ سے آپ کی ذہانت و طباعی کا پتہ چلتا ہے، ''مکاتیب ثلاثہ'' ''رسالہ حل شبہات'' ''شرح معمہ قصہ چار برادر'' وغیرہ آپ کی تالیفات موجود ہیں۔

حواشی :

۱ اصح التواریخ جلد اول خانقاہ برکاتیہ مارہرہ ص:۹۱ ۱۳۴۷ھ

۲ مآثر الکرام غلام علی آزاد بلگرامی ص: ۸

۳ نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر جلد پنجم ص: ۲۷۱

۴ منتخب التواریخ، نول کشور پریس لکھنؤ ص: ۳۰۰

۵ مآثر الکرام ص: ۳۴

۶ مآثر الکرام، ص: ۳۲

۷ اصح التواریخ جلد اول ص: ۱۴۱

۸ مآثر الکرام، ص: ۳۱

۹ سبع سنابل علامہ عبدالواحد بلگرامی ص:۹

۱۰ مآثر الکرام، ص:۳۰

ناصر علی سرھندی اور ان کا کلام

ناظرہ اسحاق
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ناصر علی سرہندی ''سرہند'' کے معزز سید خاندان میں ۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء میں پیدا ہوئے اور سرہند میں ہی انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، سرخوش ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے لہٰذا کلمات شعراء میں رقم طراز ہیں:

''از یاران قدیم فقیر بود، از خورد سالی یکجا باہم مشق می کردیم و صحبتہا میداشتیم این شعر حسن بیگ رفیع مناسب حال من واوست(۱)''

ابتدا میں ناصر علی نے نواب سیف خان کی ملازمت اختیار کی اور جب عالمگیر نے ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۶ء میں سیف خان کو الٰہ آباد کا گورنر بنا کر بھیجا تو ناصر علی بھی ان کے ساتھ گئے۔ ناصر علی ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۸ء میں بیجاپور گئے جہاں ان کو اورنگ زیب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ان کے دل میں اورنگ زیب کے لیے بہت احترام تھا اور وہ اپنی مثنوی میں انکا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

محی الدین محمد زیب اورنگ　　فضای شش جہت بر شوخیش تنگ(۲)

بیجاپور میں قیام کے دوران ذوالفقار خان نے ناصر علی کی سرپرستی کی اور جب ذوالفقار خان ۱۱۰۳ھ/ ۱۶۹۱ء میں کرناٹک کے صوبوں کی مہم پر مامور ہوا اور ارکاٹ پہنچا تو ناصر علی بھی اس کے ساتھ تھے اور کافی عرصے تک وہاں مقیم رہے، دوران قیام ناصر علی شاہ حمید الدین کے معتقد ہو گئے اور ان کی مدح میں اشعار کہے:

اینك اینك ساقی شیرین رسید　　نوبت جام حمیدالدین رسید(۳)

ناصر علی شیخ معصوم کے مرید ہوئے اور ان کے زیر اثر تصوف کے دبستان میں وارد ہوئے اور نقشبندیہ سلسلہ سے وابستہ ہوئے۔ ۱۱۰۴ھ/ ۱۶۹۲ء میں ناصر علی دکن سے دہلی واپس آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی، اور دہلی میں ہی ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۶ء میں ناصر علی نے وفات پائی۔ ان کو مقبرہ حضرت نظام الدین اولیاء کے نواح میں دفن کیا گیا، بیدل نے ''رنگ نازشکست'' سے تاریخ وفات نکالی، ان کے دوست محمد افضل سرخوش نے بھی وفات پر قطعہ تاریخ کہا تھا۔ ناصر علی کا شمار ہندوستان کے تین بڑے شعراء میں ہوتا ہے، ناصر علی اپنے عہد کے عظیم شعراء میں سے تھے، افضل سرخوش نے نظم ونثر میں جگہ جگہ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے:

در ملك سخن بود جہانگیر علی　　در مشرت دل ولی علی، پیر علی
با شعر علی نمی رسد شعر کسی　　ز انسان کہ خط کس بخط میر علی (۴)

یہاں تک کہ سرخوش نے انہیں ''آبروی ہندوستان'' کہا ہے اور ناصر علی کو ہندوستان میں اس دور کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔

''آبروی ہندوستان'' میاں ناصر علی، از اہل ہند سخنور بلند خیال معنی یاب،

ذو الہمت والکمال ہمچو او بر نخاستہ ....در ا یران صائب است و در ہند ناصر علی سوائے شعر حسن خلق و دلگرمی و خدا شناسی و ہمت و سخاوت و استغنا و بے پروائی مرتبہ دارد کہ در ہیچ مخلوق دیدہ نمی شود۔''بقدر استعداد خود ہندوستان دستگاہ نیافت، در زبان بی فیض واقع شدہ والا این چنین نازک خیال می باید کہ ''ملک الشعرای عصر'' باشد۔(۵)

ناصرعلی کے کلام کو ان کی زندگی میں ہی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی اور یہ اس شاعر کے کلام کی بلندی اور جاذبیت کی سند ہے، خود ناصرعلی کو اپنے کلام کی شہرت ومقبولیت اور اپنی شاعرانہ عظمت و برتری کا شدید احساس تھا، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

علی ہم طرح من در عالم امکان نمی باشد نہال قدس بود آواز من بیجا دمید اینجا (۶)

ناصرعلی کے کلام میں تمام مصنوعی آرائش، ایہام، تمثیل، تلمیح وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے کلام میں ہمیں خیالات اور زبان کی عجب دلکشی دکھائی دیتی ہے۔تصوف ان کا محبوب موضوع ہے، ان کے اکثر اشعار کی تخلیق یا ان کا مرجع تصوف کے نکات ہوتے ہیں یہاں ناصرعلی فرماتے ہیں:

ما مصور زادہ عشقیم شاعر نیستیم یك قلم تصویر معشوق است در دیوان ما (۷)

بلاغت، مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی، دقت پسندی، جدت ادا اور ندرت بیان ناصرعلی کے کلام کی نمایاں خصوصیتیں ہیں، جو ان کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

دقت آفرینی ناصرعلی کے کلام کی اہم خصوصیت ہے۔ان کے اشعار سے معانی آسانی سے اخذ نہیں ہو سکتے، ان کا تخیل عام طور پر پیچدار ہے اور استعارے بعید از کار و دور از فہم ہیں، یہی اسلوب شاعری بھی تھا اور اسی کو سبک ہندی سے موسوم کیا جاتا ہے، اور ناصرعلی کو خود بھی اس کا اعتراف ہے:

محال است اینکہ معنی رم کند از شوخی لفظم
اگر عنقاست دارم از نفس زنجیر درپائش

ناصرعلی اپنے عہد کے اتنے مقبول شاعر تھے کہ دوسرے شعرا ان کے طرز کی پیروی کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، لیکن ناصرعلی کے اس طرز کی پیروی وتقلید بہت کم لوگ کر سکے، افضل سرخوش کہتے ہیں کہ بہت سے شعراء تو ایسے تھے جو ناصرعلی کی پیروی وتقلید کرنے کے بجائے اپنی ہی طرز گم کر بیٹھے۔

حواشی:۔

۱۔کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدراس یونیورسٹی اسلامک سیریز، مدراس، ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۲۸۔(۲) سرو آزاد، میر غلام علی آزاد بلگرامی، کتبخانہ آصفیہ، حیدرآباد، ۱۹۱۳ء، ص ۲۶۰۔(۳) مثنوی ناصرعلی، قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص ۲۹، دفتر دوم۔(۴) کلمات الشعراء ۱۲۸۔(۵) کلمات الشعراء ص ۱۲۷-۱۲۸۔(۶) دیوان ناصرعلی، مرتبہ غلام ربانی عزیز، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۸۔(۷) دیوان ناصرعلی، قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۱۱

حضرت محمد رشید مصطفیٰ عثمانی اور ان کی شاعری

ارمان احمد، ریسرچ اسکالر،
شعبۂ عربی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی۔

دریائے گومتی کے کنارے آباد ایک چھوٹا سا شہر جونپور عہد وسطیٰ میں اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین پر حضرت عیسیٰ تاج، حضرت نصیرالدین گنبدی، حضرت عبدالقدوس قلندر، حضرت شیخ من اللہ عرف مخدوم اڈھن، حضرت قطب بینا دل قلندر، حضرت شیخ علی داؤد، شاہ شیخو مجذوب، حضرت حمزہ چشتی وغیرہ جیسے مشائخ کبار آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکے اور اپنے نور باطن سے لوگوں کے تاریک دلوں کو روشن کیا۔ وہیں ملک العلما قاضی شہاب الدین مصنف ''ارشاد'' استاذ العلماء قطب وقت شیخ افضل جونپوری، ملامحمود جونپوری ''صاحب شمس بازغہ''، مولانا الھداد ''شارح ہدایہ'' مولانا محمد جمیل (فتاوی عالمگیری کے رکن) جیسے علماء نے جونپور کو جملہ اسلامی علوم وفنون میں مرکزیت عطا کی اور زمانہ اسے ''شیراز ھند'' کے نام سے یاد کرنے لگا۔

اس سرزمین پر موضع برونہ میں ۱۰ ذیقعدہ ۱۰۰۰ھ میں حضرت شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی معروف بہ ''دیوان جی'' کی ولادت ہوئی۔ آپ کا نام کہیں کہیں عبدالرشید بھی ملتا ہے۔ آپ کا گھر علم وعرفان کا گہوارہ تھا۔ آپ کے والد کا نام شیخ مصطفیٰ جمال الحق تھا جو کہ اپنے دور کے جید عالم اور شیخ کامل تھے۔ آپ کے اجداد میں ایک سے بڑھ کر ایک اولوالعزم اولیاو علما گزرے ہیں۔ آپ نسلاً عثمانی تھے، بائیسویں پشت میں آپ کا نسب حضرت عثمان غنیؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد میں شیخ یحییٰ رومی نے دلی کا سفر کیا اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سے مرید ہوے۔ اولاً آپ کا خاندان امیٹھی ضلع بارہ بنکی میں آباد ہوا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم آپ نے اپنے ماموں مولانا شمس الدین اور استاذ العلماء شیخ محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ علم حدیث حاصل کرنے کی غرض سے آپ نے دہلی کا سفر کیا اور شیخ نورالحق سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نگرانی میں علم حدیث اور اس کی سندیں حاصل کیں۔ نو سال کی عمر میں آپ اپنے والد گرامی شیخ جمال الحق مصطفیٰ عثمانی سے سلسلہ چشتیہ میں مرید ہوئے اور کلاہ ارادت اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے سلوک کے منازل حضرت قدوۃ السالکین مخدوم شیخ طیب بن معین الدین بنارسی (متوفی ۱۰۴۲ھ) سے حاصل کی۔ شیخ کی طرف سے خرقہ اور سلسلۂ چشتیہ کی ارادت وخلافت تفویض ہوئی۔ سلسلہ قادریہ اور سہروردیہ بھی شیخ طیب بنارسی ہی سے حاصل کیا۔ اسی طرح میر سید شمس الدین کالپی بخاری سے سلسلۂ قادریہ اور شیخ عبدالقدوس قلندر سے سلسلۂ قلندریہ کی اجازت وخلافت حاصل کی۔ حضرت حسام الحق مانک پوری کے خاندان کے فرد حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ سے سلسلۂ چشتیہ و قادریہ میں اجازت حاصل کی۔ اور انھیں کے حکم سے جونپور میں قیام کیا اور خانقاہِ رشیدیہ کی بناڈالی۔

مخدوم شیخ طیب بنارسی قدس سرہ العزیز کے حکم سے درس وتدریس اور رشد وہدایت کا وہ بحر بیکراں جاری ہوا کہ دنیا آج تک اس سے فیض حاصل کررہی ہے۔ دعوت وتبلیغ اور علم وعرفان کا جو نظام قائم ہوا اس نے حضرت قطب الاقطاب

کو علمی دنیا میں بہت مشہور و مقبول بنا دیا۔ آپ کے استاد شیخ افضل جونپوری فرماتے ہیں ۔'' جس وقت علامہ تفتازانی و جرجانی دنیا سے گئے اس وقت سے کسی نے بھی اتنے بڑے دو فاضلوں کو ایک شہر میں اکٹھا نہیں دیکھا۔ یعنی ملا محمود جونپوری اور شیخ محمد رشید۔'' صاحب شمس بازغہ ملا محمود آپ کے ہم سبق تھے۔ (مآثر الکرام، اردو ترجمہ، صفحہ۔۳۱۱)۔ طالب علوم نبویہ سے آپ بہت شغف رکھتے تھے۔ حتی کہ آپ نے وصیت فرمائی کہ جس پتھر پر طلبہ جوتیاں اتارتے ہیں میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے۔

وہ شاگرد کتنے عظیم المرتبت ہوتے ہیں جن کا نام لے کر ان کے استاد کی تعریف کی جائے۔ ابو العرفان ندوی رقمطراز ہیں۔'' فلسفہ اور معقولات کی درس و تدریس میں ملا افضل جونپوری کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان کے علمی جلالت و شان و شکوہ کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ و فرائد اور دیوان محمد رشید جونپوری صاحب رشیدیہ کے استاد ہیں۔''(۱)

آگے حضرت شیخ محمد رشید قدس سرہ العزیز کے بارے میں لکھتے ہیں'' دیوان محمد رشید جونپوری کی علمی منزلت کے لیے کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔''(۲)

حدائق الحنفیہ میں آپ کا تذکرہ حنفی فقیہ کے طور پر ہوا ہے۔ مؤرخ جلیل عبدالحی الحسنی نے آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔'' الشیخ العالم الکبیر العلامة محمد رشید بن محمد مصطفیٰ بن عبد الحمید العثمانی الجونپوری، احد العلماء المبر زین فی الفقه و الاصول و التصوف۔ (۳)

مولا خواجہ علی رقمطراز ہیں۔''در جونپور شیخ عبد الرشید بزرگی ممتاز است و عنایات و الطاف ربانی سرفراز زیارت وی مشرف شوند و فوائد دینی اخذ کنید۔''(۴)

شاہجہاں نے جب آپکے اوصاف حمیدہ سنے تو آپ کو دہلی طلب فرمایا مگر آپ نہیں گئے۔ مآثر الکرام میں حضرت میر سید غلام علی آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں'' صاحب قرآن شاهجهان به استماع اوصاف قدسیه خواهش ملاقات نمود۔ ومنشور طلب مصحوب یکی از غلامان آداب دان فرستاد۔ شیخ ابا کرد و قدم کنج عجلت بیران نه گزاشت'' ۔آپ اپنے دور کے بڑے بڑے عالموں سے سبقت لے گئے۔ عہد شاہجہانی کا کوئی بھی تذکرہ بغیر آپ کے ذکر کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ آپ کی تصانیف بہت سی ہیں۔ (۱) رشیدیہ (۲) تذکرۃ النحو (۳) زاد السالکین (۴) مقصود الطالبین (۵) ترجمہ معینیہ (۶) بدایۃ النحو (۷) مکتوبات (۸) دیوان شمسی، وغیرہ۔

رشیدیہ شریفیہ کی شرح ہے۔ فن مناظرہ میں رشیدیہ کے سوا کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ یہ کتاب اکثر مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ آپ کی تصانیف کے مقابلہ آپ کے جید تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مؤرخ جلیل عبدالحی الحسنی نزھۃ الخواطر جلد اوّل کے صفحہ ۱۱۱ پر رقم طراز ہیں۔'' وفی نشر العلوم و تفریح الطلبة و تربیتهم

، امثال الشیخ احمد بن شهاب الدین دولت آبادی ..... و الشیخ محمد رشید الجونپوری (۱۰۸۳)''

آپ فارسی کے قادر الکلام اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ شمسی تخلص کرتے تھے۔ سمات الاخیار میں آپ کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے کہ...''دیوان شمسی فارسی اور ہندی تصنیف کا مجموعہ ہے۔ دیوان شمسی کا قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ کے کتب خانہ میں ہے، جو مکمل نہیں ہے۔ آپ کا کلام بہت پختہ اور تصوف کی چاشنی سے بھرا ہوا ہے۔

ہر نگاہ او دعائے دیگر است — پیچش زلفش بلائی دیگر است
من بہ یکدم سیر عالم می کنم — روح را دستیدریائے دیگر است
بربدن صد زخم خنجر گرزنی — کے بے میرم جان بجائے دیگر است
ازدل شمسی دم تمکیں مجوئے — ہردمش چوں ہو دہائی دیگر است

ڈاکٹر ڈی این چتر ویدی زاہد رقم طراز ہیں۔

''دیوان شمسی کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا اس کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوا کہ یہی خاص جلد ہے۔ کیونکہ کاغذ بھی بہت پرانا اور خستہ حالت میں ہے۔ اس کا رسم الخط بھی بہت قدیم ہے۔ موجودہ وقت کے عربی فارسی پڑھنے والوں کو اسے پڑھنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔ (اس کو دیکھ کر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قلمی نسخہ پورے دیوان کا نہیں ہے بلکہ اس کا کچھ حصہ ہے) اس سلسلہ میں کوشش چل رہی ہے کہ اس کا بقیہ حصہ بھی مل جائے۔ بہر حال جو حصہ موجود ہے اس میں فارسی کلام ہے۔ (۵)

☆ دارم دل تاریك ورخ نانہ سیاہ — ابلیس بجوید زمن خستہ سیاہ
ہر کس کہ بگویم نہ کند می گوید — لاحول ولا قوت الا باللہ
☆ گفتن بنگر تو قہر قہاری ما — مغرور مشو زوصف غفاری ما
چوں بار بحرخیال ظاہر شود — خاہم خوشتر بود نہ بیدارئی ما
☆ کن حوصلہ را بلند وبگزر زہمہ — پراز ہمہ باش و پیشترزہمہ
ازعرش بلند تر پر دل خود باش — خود رابہ گزار وباش برتر زہمہ
☆ اك عہد و فانہ کرد وصدعہدشکست — حیرانی من فزو دو خود را نمود

فارسی ادب بعہد عالمگیر میں ڈاکٹر نور الحسن انصاری رقم طراز ہیں۔

''شیخ عبدالرشید فارسی میں شعر کہتے تھے اور شمسی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں غزل، قصیدہ، قطعہ، مخمس، رباعی، ترجیع بند اور چند مختصر مثنویاں ہیں۔ شمسی کی شاعری کا عام انداز اخلاقی اور صوفیانہ ہے۔ مندرجہ ذیل غزل صنعت قلب کی عمدہ مثال ہے''۔

دل بہ تو دادم ،بیا، رحم بکن، رونما رحم بکن، رونما، دل بہ تودادم،بیا
لعل لبت بی بہا ، دست ندارم پشیز دست ندارم پشیز ،لعل لبت بی بہا
وصل توام مدعا، جان بدہم درپیت جان بدہم درپیت وصل توام مدعا
چند بما نیم، بہ کہ دروگم شویم بہ کہ دروگم شویم، چند بمانیم ما
باش بسان سہا از نظر غیر گم از نظر غیر گم، باش بسان سہا
درد تو باشد دوا ، شمسی بیچارہ را شمسی بیچارہ را،درد تو باشد دوا

اس غزل کا انداز سیدھا سادا اصاف اور بے لاگ ہے۔شمسی کی عام غزلیہ شاعری کا یہی انداز ہے،لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی رباعیاں غزلوں سے زیادہ جاندار اور دلکش ہیں۔مثال کے طور پر دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں(۲):

۱ چون دل داری برو ، دل آرام طلب مہ روی، سمن بوی، گل اندام طلب
جامی کہ برد باغ ارم رشك ازو چشمی کہ بودہم می دہم جام طلب
۲ یا رب قدحی بدہ کہ سرمست شوم یك جرعہ ازان نوشم و از دست شوم
در دہ قدحی و گر کہ گردم ہمہ نیست چون نیست شوم زخود،بہ تو ہست شوم(۲)

ڈاکٹر نورالحسن نے یہ غزل اور رباعیاں دیوان شمسی بانکی پور نمبر ۱۹۰۵ ورق ۳ اور ورق ۸۰،۷۰ سے لی ہیں۔اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ دیوان شمسی کا ایک نسخہ بانکی پور پٹنہ میں بھی ہے۔آپ کی وفات ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ بروز جمعہ جونپور میں ہوئی۔نماز جنازہ شیخ محمد ماہ نے پڑھائی۔رشید آباد جونپور میں مدفون ہوئے۔قطعہ تاریخ میں درج آخری مصرع ''آں محبّ خدا شداز دنیا'' سے سال وفات ۱۰۸۳ھ مراد لیا گیا ہے:۔ قطعہ:

آن محمد رشید اہل یقیں قبلہ برگزیدگانِ خدا
جامع علم ظاہروباطن عارفانِ زمانہ را ابلحا
شوق وصلش نمودچوں بیتاب برد تشریف سوے رب علا
شور ہلاًزقدسیان برشد رحمت آواز داد زود بیا
رفت خود از میان منی وتوئی شدہ واصل چواو بذات خدا
بود صبح نہم زماہ صیام کہ شدایں حادثہ الم افزا
زدرقم سال وصل اوکاتب آن محب خدا شد ازدنیا

حوالہ :

(۱) ہندوستان میں اسلامی علوم ادبیہ۔ص ۷۳
(۲) ایضاً۔۷۳

(۳) نزہۃ الخواطر۔جلد۵۔ص۳۹۷
(۴) احوال وآثار عبداللہ خویشگی ۔ص۴۲
(۵) تصوف اور مشائخ خانقاہ رشیدیہ۔ص۱۴۶
(۶) فارسی ادب بعہد اورنگ زیب۔ص۲۹۶

فہرست مراجع

(۱) مآثر الکرام، میر سید غلام علی آزاد بلگرامی، مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء
(۲) احوال وآثار عبداللہ خویشگی قصوری، محمد اقبال مجددی، دارالمورخین لاہور ۱۹۷۲ء
(۳) الاحسان، حسن سعید صفوی، شاہ صفی اکیڈمی الہ آباد ۲۰۱۲ء
(۴) تصوف اور مشائخ رشیدیہ، ڈاکٹر ڈی این چترویدی، پرمانند پور، بلیا ۱۹۹۴ء
(۵) سمات الاخیار، محمد عبدالمجید کاتب، الکلیل المطابع بہرائچ ۱۳۴۴ھ
(۶) فارسی ادب بعہد اورنگزیب، ڈاکٹر نورالحسن انصاری، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی ۱۹۶۹ء
(۷) مآثر الکرام (اردو ترجمہ)، آزاد بلگرامی، مترجم یونس رضا مونس او یسی، جامعۃ الرضا بریلی ۲۰۰۸ء
(۸) مناقب العارفین، شیخ یٰسین جھونسوی، مترجم سید غلام سمنانی، خانقاہ رشیدیہ جونپور ۲۰۰۰ء
(۹) نزھۃ الخواطر، عبدالحی الحسنی ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۹۲ء
(۱۰) ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات، عمادالحسن آزاد فاروقی، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ دہلی، ۱۹۸۶ء

میراث خطی

فارسی زبان وادب کا ذوق رکھنے والے اس بات سے واقف ہیں کہ فارسی ادبیات کا زیادہ تر سرمایہ اس ترقی کے دور میں بھی ابھی تک خطی نسخوں کی شکل میں موجود ہے۔لہٰذا ''دبیر'' میں اس کالم کے تحت ایک یا ایک زائد تصانیف کے خطی نسخوں کی تفصیل فراہم کی جاتی ہے۔اس مرتبہ ''ذخیرۃ الملوک'' اور'' خلاصۃ التواریخ'' کے خطی نسخوں کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔(مدیر)

خلاصة التواريخ کے خطی نسخے

محمد ارشاد عالم،
پی ایچ ڈی،شعبۂ فارسی،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

خلاصۃ التواریخ کے متعدد نسخے دنیا کی مختلف لائبریروں میں ہیں۔ذیل میں ان نسخوں کی تفصیلات درج ہے۔

(۱) **نسخہ خدابخش لائبریری ، پٹنہ**

خدا بخش لائبریری میں یہ نسخہ شمارہ۔(HL-94)۔موجود ھے.اس نسخہ کو ھفتم رجب ۱۲۳۴ھجری مطابق می ۱۸۱۹عیسوی میں لکھا گیا ھے. یہ نسخہ ان تمام نسخون میں سب ودیم جس سے میں نے استفادہ کیا ھے. یہ نسخہ خط نستعلیق میں ھے اور،۴۶۳،اوراق پر مشتمل ھے۔ ہر صفحہ سطر،۱۷ کا حامل ہے. یہ نسخہ ۱۲۳۴ھ، بدستخط سا کدام،لکھا گیا جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے ظاہر ہے:

'بتاريخ هفتم رجب ۱۲۳۴ هجرى مطابق تاريخ سيوم ماه مى ۱۸۱۹ عيسوى به سمت بيسا كهه سدى نومى روز سنه .... روز بر آمده بدستخط ساكدام با تمام رسيد. تمت تمام شد كار من نظام شد.

نوشته نماند سيه بر سفيد		نويسنده را هشت فردا اميد
هر كه خواند دعا طمع دارم		ز آنكه من بنده گنهگارم

(۲) مولانا آزاد لائبریری علیگڑہ مسلم یونیورسٹی، علیگڑہ

مولانا آزاد لائبریری علیگڑہ میں یہ نسخہ شمارہ۔(۶۵۰/۲۸)،سلیمان کلکشن کہ نام سے موجود ہے. یہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے اور،۳۲۸،اوراق پر مشتمل ہے۔ ھر صفحہ سطر،۱۷ کا حامل ہے. یہ نسخہ ۱۲۴۶ھ میں بدستخط اسغر الناس،لکھا

گیا جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے ظاہر ہے:

کتاب خلاصة التواریخ تصنیف منشی المناسی سجان رای کھتری بھنڈاری ساکن بٹالہ بتاریخ بست و هفتم شهر شوال ۱۲٤٦ هجری مطابق می ماه بیسا کھه بدی تر دو سی ۱۳ روز یك شنبه سمت ۱۸۸۸ عیسوی راجه بکرماجیت ساکه ساتبالن بدستخط اصغرالناس قدوی هرپنج رای کھتری سنال ساکن قصبه بساره حسب الارشاد لاله صاحب والا ثاقب علو خاندان لاله کپورسنگه صاحب خلف لاله صاحب بهت نصیب لاله همرسنگه صاحب پدر راجه دلارام بکٹه باسی عرف منو پوری قصبه قصور ساکن قصبه سنام بناس خطر لاله صاحب بلند اقبال سنوجه سیرت خجسته حصال لاله دیوی سنگه جه هنگام بر آمدن یکپاس روز بمقام قصبه سنام بر چاه لو احداث بحضور بابا صاحب ترن تارن باماٹھه دیگر باهتمام رسانید ایزد ذوالجلال مو کلام یعنی لاله کپور سنگ و دویدی سنگه و لاله عمر خضری و نصیه سکندر بخشیده در ترقی دولت اقبال و حصول مراد فرزندان هر روز تراید دارم مظهر بعهده منشی گری بزیر دامن دولت صاحبان موصوف بحولی تمام بعیش مالا کلام گذیده خود مینمایم و ت عمر امید دارم باد لاله زندگانی می درینخانه بسر آید زیاده مسرت باد و خیریت باد تم تمام شد.

هر که خواند دعا طمع دارم ز آنکه من بنده گنهگارم

(۳) مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں یہ نسخہ شمارہ۔(۳۱۹/۸۹)،عبدالسلام کلکشن کہ نام سے موجود ہے.اس کا کاتب سید شمس الدین احمد ہے. یہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے اور،۳۰۹،اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ سطر،۱۷ کا حامل ہے. یہ نسخہ ۱۳۰٦ھ میں لکھا گیا جیسا کہ اس کے ترقیمہ میں دیا گیا ہے.اس نسخہ کے شروع میں اور آخر میں کچھ صفحے الگ سے جوڑا گیا ہے:

بقم سید شمس الدین احمد طالب علم اودیپوری میواری تاریخ هفتدهم محرم الحرام ۱۳۰٦ هجری مطابق بست و چهارم ستمبر ۱۸۸۸ عیسوی موافق آسوج بدهم سمت ۱۹٤٥ روز سه شنبه زینت اختتام یافت.

(٤) مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں یہ نسخہ شمارہ۔(٦٤٨/٢٦)،سلیمان کلکشن کہ نام سے موجود ہے.اس نسخے کے کاتب کا نام ذین الدین' قوم کایست' ہے. یہ نسخہ خط نستعلیق میں ھے اور،۲٦٥،اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ سطر۱۹ کا حامل ہے. یہ نسخہ دھم محرم ۱۲۴۷ھ میں لکھا گیا جیسا کہ اس کے ترقیمہ میں لکھا ہوا ہے:

نسخہ خلاصتہ التواریخ دھم محرم ۱۲٤۷ ھجری مطابق جیٹھ سدی دواوسی سمت ۱۸۸۹ عیسوی بخط بندہ ذین الدین قوم کایست حسب الارشاد محبوب علی خان پسر قاسم خان افغان روز شنبہ وقت یکپاس رو بر آمدہ سورت اختتام یافت.

ھر کہ خواند دعا طمع دارم ز آنکہ من بندہ گنھگارم

.....

مخطوطات:۔

نام کتاب	مصنف	کتابخانہ	مخطوطات نمبر
۱. خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	HL. NO - 94
۲ .خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	HL. NO - 1761
۳. خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	HL. NO - 4080
٤. خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	HL. NO - 329
٥ .خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	HL. NO - 2908
٦. خلاصتہ التواریخ	سجان رای ببھنڈاری	مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ	۲۸/٦٥۰، سلیمان کلکشن
۷. خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ	۸۹/۳۱۹، عبدالسلام کلکشن
۸. خلاصتہ التواریخ	سجان رای بھنڈاری	مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ	۲٦/٦٤۸، سلیمان کلکشن

۹. خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۳۲/۳۵، حبیب گنج کلکشن

۱۰.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۷۰، یونیورسٹی کلکشن

۱۱.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۲۵/٦٤٧، سلیمان کلکشن

۱۲.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری ھسٹری ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ ٤۲، یونیورسٹی کلکشن

۱۳.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۱٦/۹٥٤، ضمیمه سبحان اللّٰه

۱٤.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۲۷/٦٤۹، سلیمان کلکشن

۱٥.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۲۹/٦٥۱، سلیمان کلکشن

۱٦.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۳۰/٦٥۲، سلیمان کلکشن

۱۷.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۲۹، سلیمان کلکشن

۱۸.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۲۹، سلیمان کلکشن

۱۹.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۱۰/۳۲،حبیب گنج کلکشن

۲۰.خلاصته التواریخ سجان رای بھنڈاری مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ ۱۱/۹۱، قطب الدین کلکشن

ہندوستان میں ذخیرۃ الملوک کے اہم خطی نسخے

محمد ریاض،
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کتاب اور مؤلف کا تعارف: 'ذخیرۃ الملوک' حضرت میر سیّد علی شاہ ہمدانیؒ (ولادت ۷۱۴ھ، وصال ۷۸۶ھ) کی فارسی زبان میں اہم اور معروف ترین تالیف ہے۔ آپؒ کو حضرت امیر کبیر اور علی ثانی کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شاہ ہمدانؒ عالم اسلام کے بزرگ ترین عالموں، صوفیوں، اور دینی بزرگوں میں سے تھے۔ دین اسلام کو توسیع دینے میں شاہ ہمدانؒ کی شخصیت ظلمات میں آفتاب کی مانند ہے اور بالخصوص وادیٔ کشمیر میں شاہ ہمدانؒ نے ہزاروں سال کے خرافاتی عقائد اور ذہنی جمود وظلمت کی اسیری کو مٹا کر فطری اور روشن یقین، بصیرت، مساوات اور اخوت وصلح وصفا کا پاکیزہ ماحول قائم کر دیا اور وادیٔ کشمیر کے ستم زدگان کو ہزاروں سجدوں سے آزاد کرا کے بس ایک ذات واحد کے سجدہ کے لئے جھکنے پر ہمیشہ کے لیے معتقد بنا دیا۔ شاہ ہمدانؒ کی تالیفات وتصنیفات کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہے، اور یہ دنیا کے بیشتر اور مشہور کتب خانوں میں منتشر اور موجود ہیں، لیکن انکی تمام تصنیفات میں 'ذخیرۃ الملوک' بہت ہی معروف اور اہم ترین تصنیف ہے جسکے موضوعات بہت ہی وسیع وعریض ہیں۔ ذخیرۃ الملوک کا موضوع علم سیاست اور اخلاق ہے جو ایک مقدمہ اور دس ابواب پر مشتمل انسان کے ظاہری اور باطنی طرز حکومت، شریعت اسلام کے امور وقوانین، اور علم اخلاق پر خواجہ نصیر الدین طوسیؒ کی 'اخلاق ناصری' اور حضرت امام غزالیؒ کی 'کیمیائے سعادت' کے ہم پلہ ہے۔ شاہ ہمدانؒ نے ذخیرۃ الملوک کی تالیف آٹھویں صدی ہجری میں سلاطین کشمیر کی فرمایش پر کی تھی۔ یہ اہم کتاب سلاطین کشمیر اور بعد میں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے نصاب درس وتدریس میں بھی شامل رہی ہے۔ اس کتاب کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ [۱]

ذخیرۃ الملوک کے قلمی نسخوں کا جائزہ: میر سیّد علی شاہ ہمدانیؒ کی کتاب 'ذخیرۃ الملوک' کے قلمی نسخوں سے متعلق محققین نے ابھی تک جو مستند جائزہ پیش کیا ہے، اُن تمام شواہد کو مدنظر رکھ کر یہ کہنا بجا ہوگا کہ محققین نے زیادہ تر اُن قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے جو یورپ، مشرق وسطیٰ اور مُلک پاکستان کے معروف کُتب خانوں میں موجود ہیں، جبکہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے چند اہم کتب خانوں میں موجود 'ذخیرۃ الملوک' کے قلمی نسخوں کی مکمل اطلاعات ابھی تک محققین اور فارسی ادب سے وابستگی رکھنے والوں تک نہیں پہنچیں ہیں۔ یورپ کے تمام اہم کتب خانوں میں دستیاب 'ذخیرۃ الملوک' کے قلمی نسخوں سے متعلق سابق پروفیسر ڈاکٹر شمس الدّین احمد صاحب نے اپنی ایک کتاب بعنوان 'ذخیرۂ سعادت' میں تقریباً اہم اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ لیکن میرا مقصد چونکہ ذخیرۃ الملوک کے اُن اہم قلمی نسخوں سے ہے جو کہ ہندوستان کے چند اہم کتب خانوں میں موجود ہیں، لہذا ذیل میں حتی الامکان ان تمام قلمی نسخوں کا مختصر ذکر پیش کرنے کی

سعی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ محققین اور محبان فارسی ادب کے لئے یہ تحقیقی مقالہ سودمند ثابت ہوگا۔

۱. کتا بخانہ علامہ اقبال دانشگاہ کشمیر ، سرینگر میں دستیاب قلمی نسخے :

کتا بخانہ علامہ اقبال، سرینگر میں ذخیرۃ الملوک کے کُل گیارہ قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ یہ تمام قلمی نسخے راقم الحروف کے چشم دید ہیں جنکا ذکر حسب ذیل پیش کیا جاتا ہے۔

نسخۂ اوّل: ذخیرۃ الملوک کا نسخۂ اوّل خط نستعلیق میں ہے۔ اس نسخے کے آغاز یعنی اوّل ورق پر دو تاریخیں، ایک ۱۲۶۱ھ اور دوسری ۱۲۶۶ھ درج ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ تاریخوں میں یا انکے درمیان میں یہ نسخہ تحریر کیا گیا ہو۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور اسکا رنگ صاف و چمکدار ہے اور عبارت با آسانی پڑھی جاسکتی ہے۔ نسخے کی جلد سیاہ چمڑے کی ہے جس پر ایک مہر بھی ثبت ہے۔ اوّل ورق پر سرخ سیاہی کیساتھ کتاب کا نام اور مصنف کا نام تحریر کیا گیا ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں نسخے کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ کتا بخانہ علامہ اقبال میں موجود یہ نسخہ کُل ۱۶۰ فولیوز پر مشتمل ہے جسکی قد و قامت ۱۴×۲۳ سینٹی میٹر ہے، اور اسکا شمارۂ فہرست ۱۸۴۵ ہے۔

نسخۂ دوم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۱۴۷۴، سن کتابت۔ ۱۰۱۶ھ، فولیو۔ ۲۲۳، سائز۔ ۱۲x۲۱ مکمل

نسخۂ سوم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۱۸۲۴، سن کتابت۔ ۱۲۷۸ھ، فولیو۔ ۱۹۸، سائز۔ ۱۲.۵x۲۳ مکمل

نسخۂ چہارم: خط۔ نستعلیق، فہرست شمارہ۔ ۱۹۱۹، سن کتابت۔ نامعلوم، فولیو۔ ۱۹۳، سائز۔ ۱۵x۲۵ مکمل

نسخۂ پنجم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۱۱۵۰، سن کتابت۔ نامعلوم، فولیو۔ ۱۳۷، سائز۔ ۱۵x۲۵.۳، ناقص الآخر

نسخۂ ششم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۱۹۷۰، سن کتابت۔ نامعلوم، سائز۔ ۱۱x۲۱ مکمل

نسخۂ ہفتم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۲۳۸۱، سن کتابت۔ ۱۲۱۹ھ، فولیو۔ ۲۲۵، سائز۔ ۱۶.۲x۲۴ مکمل

نسخۂ ہشتم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فرست۔ ۲۲۸۱، سن کتابت۔ نامعلوم، فولیو۔ ۲۱۷، سائز۔ ۱۳x۲۴، ناقص الآخر

نسخۂ نہم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۲۹۴۳، سن کتابت۔ ۱۱۰۲ھ، فولیو۔ ۱۱۶، سائز۔ ۱۰x۲۳ مکمل

نسخۂ دہم: خط۔ نستعلیق، شمارہ فہرست۔ ۲۴۵۰، سن کتابت۔ ۱۱۹۷ھ، فولیو۔ ۱۷۳، سائز۔ ۱۱.۲x۲۲ مکمل

نسخۂ یازدہم: خط۔ نسخ، شمارہ فہرست۔ ۱۹۸۴، سن کتابت۔ نامعلوم، فولیو۔ ۱۴۹، سائز۔ ۱۵.۵x۳۵ مکمل (مجموعہ)

۲. ادارۂ تحقیق عربی و فارسی راجستھان، جے پور میں موجود قلمی نسخہ:

راجستھان جے پور کے ادارۂ تحقیق عربی و فارسی میں بھی ذخیرۃ الملوک کا ایک اہم قلمی نسخہ موجود ہے جو خط نستعلیق میں ہے۔ یہ ایک مکمل نسخہ ہے جو کُل ۲۵۱ فولیوز پر مشتمل ہے۔ اس نسخے کو دوست محمد بن امیر محمد نام کے کسی کاتب نے سن ۹۲۲ھ میں کتابت کیا تھا۔ اس نسخے میں اوراق کے چاروں اطراف خوبصورت سنہری بارڈر ہیں۔ نسخہ صاف ہے اور قابل استفادہ ہے۔ ذخیرۃ الملوک کے اس نسخے کے پہلے فولیو پر کسی مغل بادشاہ کی مہر بھی ثبت ہے اور ساتھ ہی فارسی میں کچھ تحریریں بھی ہیں جنکا مطالعہ دشوار ترین ہے۔ نسخے پر کسی مغل بادشاہ کی مہر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نسخہ کسی مغل بادشاہ یا کسی مغلیہ امیر یا وزیر کے پاس رہا ہوگا۔ ابوالبقاء بن یونس الحسنی نام کے کسی شخص نے سن ۱۵۴۸ء میں اس نسخے کی کہیں کہیں

تصحیح وتدوین بھی کی ہے۔اس اہم نسخے کی قدوقامت ۱۵×۲۳ سینٹی میٹر ہےاوراسکا شمارۂ کتاب ۳۲۳۲ ہے۔ [۲]

۳. کتابخانہ درگاہ عالیہ مہدویہ، پالن پور گجرات میں موجود قلمی نسخہ:

گجرات کے کتابخانہ درگاہ عالیہ مہدویہ، پالن پور میں بھی ذخیرۃ الملوک کا ایک قلمی نسخہ موجود ہےاوراس نسخے کی میکروفلم بھی دستیاب ہے۔اس نسخے پر کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔یہ ایک ناقص نسخہ ہےاوراسکا آغاز کچھ اس طرح سے ہے۔

'و من کتاب ذخیرۃالملوك در باب احتساب ای عزیز چون بدلایل آیات و اخبار۔۔۔۔'

ذخیرۃ الملوک کا یہ ناقص نسخہ خط نستعلیق میں ہے جسکا شمارۂ میکروفلم ۱۸/۳۴ ہے۔ [۳]

٤. کتابخانہ رامپور رضا خان میں موجود قلمی نسخے:

کتابخانہ رامپور رضا خان میں ذخیرۃ الملوک کے کُل سات قلمی نسخے موجود ہیں اور یہ نسخے بھی راقم الحروف نے دیکھے ہیں۔ان نسخوں کا ذکر حسب ذیل پیش کیا جاتا ہے۔

نسخۂ اوّل: مذکورہ کتابخانہ میں موجود یہ نسخہ ناقص ہے جو کُل ۱۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ذخیرۃ الملوک کا یہ نسخہ منصور بن لطف اللہ ختلانی نے سن ۸۸۳ھ میں کتابت کیا تھا جسکی شہادت نسخے کے اندر ایک تحریر ہے۔نسخہ خط نستعلیق میں ہےاوراسکا شمارۂ کتاب ۱۷۷۸/۱۷۷۸اب ہے، ردّیف کتابخانہ ۱۳ء۴۳ ہے۔

نسخۂ دوم: ذخیرۃ الملوک کا یہ نسخہ کُل ۲۳۶ اوراق پر مشتمل ہے جو خط نستعلیق میں ہےاوراسکے کاتب کی تصدیق ذیل کی تحریر سے بخوبی ہوتی ہے۔

'سنہ ۱۰۱۶ھ العبد المذنب محمد بجهت کتابخانۂ نواب نامداری خیرخواہ اهل نواب مرزا سیف اللّٰه بتاریخ ۲۲ شهر جمادی الآخر روز جمعه که خطبه دارالسلطنت و خلافت حضرت ظل الٰهی شاه سلیم غازی خلد اللّٰه ابداً واقع شد'

یہ ایک مکمل نسخہ ہےاور اچھی حالت میں دستیاب ہے، جسکا شمارۂ کتاب ۱۷۷۹ ہےاور ردّیف کتابخانہ ۴۱۸ ہے۔

نسخۂ سوم: خط۔نستعلیق، شمارہ کتاب ۱۷۸۰ (۳۱۷م)، اوراق۔۸۲، مکمل

نسخۂ چہارم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔۱۷۸۱ (۴۱۹م)، اوراق۔۲۴۹، کتابت۔۱۰۶۰ھ، مکمل

نسخۂ پنجم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔۱۷۸۲ (۳۳۰م)، اوراق۔۲۸۸، مکمل

نسخۂ ششم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔۱۷۸۲اب (۴۱۲۳م)، اوراق۔۱۸۲، کتابت۔نامعلوم، ناقص

نسخۂ ہفتم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔۱۷۸۳ (۱۳۰۶م)، اوراق۔۱۶۴، کتابت۔نامعلوم، ناقص (۴)

۵. ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال میں موجود قلمی نسخے کا جائزہ:

ذخیرۃ الملوک کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال، کلکتہ میں بھی موجود ہے۔یہ ایک مکمل اور اہم نسخہ

ہے جو بارہویں صدی ہجری میں عباداللہ بن خواجہ فائیدی نام کے کسی کاتب نے کتابت کیا تھا۔ یہ نسخہ کُل ۱۹۶ فولیوز پر مشتمل ہے اور اسکا خط بھی نستعلیق ہے۔نسخہ صاف اور خوشنما ہے اور پڑھا جا سکتا ہے۔اس نسخے کے آخری دو فولیوز پر کچھ اشعار بھی درج ہیں۔اس نسخے کا سائیز ۸۵×۱۷۰ س م ہے۔ ۵

۶. کتابخانہ مولانا آزاد، دانشگاہ اسلامی علیگڑھ میں موجود قلمی نسخوں کا جائزہ:

کتابخانہ مولانا آزاد میں ذخیرۃ الملوک کے کُل چار قلمی نسخے موجود ہیں جنکی مائیکرو فلم بھی دستیاب ہے۔راقم الحروف نے یہ چاروں نسخے دیکھے ہیں، لہذا انکا جائزہ حسب ذیل ہے۔

نسخۂ اوّل: مذکورہ کتابخانہ میں دستیاب یہ قلمی نسخہ حسن دہلوی نام کے کسی کاتب نے سن ۱۰۰۰ھ میں گجرات کے بندر سورت میں کتابت کیا تھا، جو نسخے کے اندر اسطرح درج ہے۔

'فی التاریخ ۲۴ شهر جمادالاول ۱۰۰۰ھ کتبه بنده کمترین المذنب حسن دهلوی در بندر سورت تحریر یافت' (نسخہ،فولیو،۱۹۶)

ذخیرۃ الملوک کا یہ مکمل نسخہ کُل ۱۹۶ فولیوز پر مشتمل خط نستعلیق میں ہے۔اسکی جلد سیاہ و چرمی ہے اور یہ نسخہ بہت ہی اچھی حالت میں دستیاب ہے۔ پہلے ورق پر کچھ تحریر ہے جو پڑھنا کافی دشوار ہے۔اس نسخے کے اوراق بالکل صاف اور چمکدار ہیں اور اس میں عربی عبارات کو سرخ سیاہی کیساتھ واضح کیا گیا ہے۔اوراق کے چاروں اطراف سرخ اور سیاہ رنگ کے بارڈر ہیں۔اس نسخے کی ۱۷ سطور ہیں، اور اسکی لمبائی ۲۳ اور چوڑائی ۱۴ سینٹی میٹر ہے۔اسکا شمارۂ کتابخانہ عبدالسلام کلکشن ،۱۸/ ۲۴۸ ہے۔نسخہ قابل استفادہ ہے۔

نسخۂ دوم: یہ نسخہ خط نستعلیق میں ایک مکمل نسخہ ہے جسکے کُل ۴۱۲ فولیوز ہیں۔اس نسخے پر کاتب کا نام درج نہیں ہے البتہ سن کتابت سے متعلق نسخے کے آخری ورق پر ایک عبارت درج ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے۔

'تحریر فی التاریخ یوم الثلثاء سیوم مشهر صفر ختم بالخیر والظفر ۱۰۱۴ھ در دارالخلافه اگره در بالا خانۂ دارالضرب شهر مذکور صورت اتمام و سمت اختتام پذیرفت --' (نسخہ،فولیو،۴۱۲)

اس نسخے کی جلد موٹی و سیاہ چمڑے کی ہے۔اسکے اوراق موٹے، ہلکے زرد، اور صاف ہیں اور عربی عبارات کے زیر سرخ لکیریں بھی ہیں۔اس نسخے کی کہیں کہیں تصحیح بھی کی گئی ہے۔نسخہ قابل استفادہ ہے۔اس نسخے کی ۱۴ سطور ہیں، اسکی لمبائی ۲۵، چوڑائی ۱۳ س م ہے اور شمارۂ کتابخانہ، سبحان اللہ کلکشن، ۱/ ۷ء۳۹۷ ف ہے۔

نسخۂ سوم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔حبیب گنج ۳۰/۱۱، فولیو۔۲۴۲، سائز۔۲۴x۱۸، سن کتابت۔نامعلوم، مکمل

نسخۂ چہارم: خط۔نستعلیق، فہرست شمار۔سبحان اللہ۔۶۷/۷ء۲۹۱۷ف، سائز۔۱۳x۲۲، مکمل

۷. کتابخانہ خدا بخش آرینٹل پبلک ، پٹنہ، بہار میں موجود قلمی نسخہ:

کتابخانہ خدا بخش میں ذخیرۃ الملوک کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور اسکی تاریخ کتابت سن ۹۶۸ھ ہے لیکن کاتب کا نام معلوم نہیں ہے۔ یہ نسخہ اچھی حالت میں ہے اور خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اسکے ۳۸ فولیوز کے بعد چند فولیو غائب ہیں۔ اوراق کے چاروں اطراف بارڈر ہیں اور فارسی عبارت صاف و دلکش ہے۔ کہیں کہیں عربی عبارات کو سرخ اور نیلے رنگ کی سیاہی کیساتھ مزین بھی کیا گیا ہے۔ اس نسخے کے کُل ۸۱ فولیوز ہیں اور ۲۱ سطور ہیں۔ اسکی قد و قامت ۷×۱۱ سینٹی میٹر ہے اور شمارۂ فہرست ۹۴۳ ہے۔ ۶

۸. کتابخانہ جامعہ ہمدرد، مرکز تحقیق فارسی، تغلق آباد، نئی دھلی میں موجود نسخہ:

کتابخانہ جامعہ ہمدرد تغلق آباد نئی دہلی میں بھی ذخیرۃ الملوک کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ناقص ہے اور ذیل کی عبارت سے اسکا آغاز ہوتا ہے۔

'اثبات کند دیگر حاکمی که بسبب تکبر و بزرگی گرامی کند--------'

اس نسخے کے کُل ۱۵۴ فولیوز ہیں اور ۲۱ سطور ہیں۔ یہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے اور کافی قدیم اور بوسیدہ ہے۔ اسکے اوراق کرم خوردہ ہیں۔ کاتب کا نام معلوم نہیں ہے اور نہ ہی تاریخ کتابت درج ہے۔ اسکی قد و قامت ۱۵.۵×۲۷ س م ہے اور شمارۂ کتاب ۰۴۵۰، گنج بخش، ۱۰ء اہے۔ ۷

۹. کتابخانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دھلی میں موجود قلمی نسخے:

دانشگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے کتابخانہ میں ذخیرۃ الملوک کے ذیل میں دیے گئے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔

نسخۂ اوّل: یہ قلمی نسخہ مکمل ہے جو کُل ۲۰۴ فولیوز پر مشتمل ہے۔ اس نسخے کا خط نستعلیق ہے اور اسکی ۱۷ سطور ہیں۔ ذخیرۃ الملوک کا یہ نسخہ لطف اللہ بلگرامی نام کے کاتب نے جمادی الاوّل، سن ۱۱۰۰ھ میں کتابت کیا تھا۔ نسخہ اچھی حالت میں دستیاب ہے اور عبارت با آسانی پڑھی جاسکتی ہے۔ اسکی قد و قامت ۱۵×۲۲ س م ہے۔ اسکا شمارۂ فہرست ۳۶۴، اور شمارۂ کتاب ۰۴۷۱ ہے۔ یہ نسخہ قابل استفادہ ہے۔

نسخۂ دوم: مذکورہ کتابخانہ میں موجود ذخیرۃ الملوک کا یہ دوسرا نسخہ بہت ہی ناقص ہے جسکے کُل ۶ فولیوز باقی ہیں۔ یہ نسخہ ۱۶ سطور پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں ہے۔ اسکے کاتب کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس نسخے کے آخری چند اوراق کرم خوردہ ہیں۔ اسکی قد و قامت ۱۳.۵×۲۳ س م ہے اور اسکا شمارۂ فہرست ۳۶۴، اور شمارۂ کتاب ۰۴۷۲ ہے۔ ۸

۱۰. کتابخانہ سالار جنگ، حیدرآباد میں موجود قلمی نسخوں کا جائزہ:

حیدرآباد کے کتابخانہ سالار جنگ میں ذخیرۃ الملوک کے کُل چھ قلمی نسخے موجود ہیں، جن کا ذکر حسب ذیل ہے۔

نسخۂ اوّل: ذخیرۃ الملوک کا یہ نسخہ خوبصورت خط نستعلیق میں ایک مکمل نسخہ ہے جسکے کُل ۸۴ فولیوز ہیں۔ اسکے کاتب کا نام معلوم نہیں ہے البتہ یہ نسخہ ۴ جمادی الاول سن ۸۷۰ھ میں کتابت کیا گیا تھا۔ نسخے کی حالت اچھی ہے، اوراق ہلکے نم، کرم خوردہ اور زرد ہیں۔ اسکے اوراق کے چاروں اطراف خوبصورت سنہری بارڈر کھینچے ہوئے ہیں۔ اس نسخے کی ۳۱ سطور ہیں

اوراسکی قد وقامت ۱۳.۲×۲۱.۴ س م ہے۔نسخہ قابل استفادہ ہے۔ ۹
نسخۂ دوم: خط۔نستعلیق، سن کتابت۔۱۱۸۷ھ، فولیو۔۹۶، سائز۔۱۲.۹×۱۸.۵، سطر۔۲۷، مکمل (۱۰)
نسخۂ سوم: خط۔نستعلیق، کتابت۔۱۰۵۱ھ، فولیو۔۴۱۹، سائز۔۸.۷×۱۷.۷، مہر۔رفیع الدولہ، سطر۔۱۲، مکمل (۱۱)
نسخۂ چہارم: خط۔نستعلیق، کتابت۔۱۰۹۷ھ، فولیو۔۱۴۹، سائز۔۸.۶×۱۵.۹، سطر۔۱۷، مکمل (۱۲)
نسخۂ پنجم: خط۔نستعلیق، کتابت۔۱۱۱۸ھ، فولیو۔۱۷۹، سائز۔۶.۴×۱۴.۴، کاتب۔عنایت اللہ، سطر ۱۹، مکمل (۱۳)
نسخۂ ششم: خط۔نستعلیق، فولیو۔۲۹۰، سائز۔۷.۶×۱۷.۷، مہر۔منیرالملک، سطر۔۱۵، مکمل (۱۴)

۱۱. (Indra Gandhi National Centre for The Arts(New Delhi)

مذکورہ مرکز میں بھی ذخیرۃ الملوک کا ایک مکمل نسخہ موجود ہے جو خط نستعلیق میں ہے۔اس نسخے کے ۸۱ فولیوز ہیں اور اسکا شمارۂ کلکشن ۲۲۹ ہے۔(۱۵)

۱۲. (Jammu and Kashmir Academy of Art, Culture and Languages)

ریاست جموں وکشمیر کی کلچرل اکادمی میں بھی ذخیرۃ الملوک کے کُل پانچ قلمی نسخے موجود ہیں جنکا مختصر ذکر حسب ذیل ہے۔
اوّل نسخہ : خط نستعلیق میں مکمل نسخہ ہے جسکے ۲۰۲ فولیوز ہیں۔اسکے کاتب کا نام بابا محمد افضل ہے۔نسخہ اچھی حالت میں موجود ہے۔اسکا شمارۂ فہرست ۱۱ ہے۔
نسخۂ دوم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔۳۰۲، نامکمل
نسخۂ سوم: خط۔نستعلیق، شمارہ فہرست۔۳۱۳، فولیو۔۱۹۶، کاتب۔نورمحمد، مکمل (۱۶)

مندرجہ بالا جن اہم کتب خانوں اور تحقیقی مراکز میں ذخیرۃ الملوک کے قلمی نسخوں کی دستیابی کا ذکر ہو چکا ہے، انکے علاوہ بھی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی بیشتر دانشگاہوں کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں، مکاتیب یا دینی وعلمی اداروں میں، یا دینی وعلمی گھرانوں میں، یا پھر کسی عالم کے ذاتی کتابخانہ میں ذخیرۃ الملوک کے اور بھی بہت سے قلمی نسخے موجود ہوں گے جو کسی نہ کسی وقت محققین کی کاوشوں سے منظر عام پر آجائیں گے۔اس لیے کہ ذخیرۃ الملوک کے قلمی نسخے مغربی ممالک اور بالخصوص ایشیا کے تمام اہم کتب خانوں میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔اور یہی بات اس کتاب کے مرغوب، مطلوب اور مقبول ہونے کی واضح دلیل ہے۔

حوالہ جات:

۱. ۱. صفحہ، ۷ تا ۱۸، ذخیرۂ سعادت (حصہ اوّل)، از پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد، ۱۹۹۳ء۔ ۲. سید میر علی ہمدانی، از دکتر سیدہ اشرف ظفر، ۲۰۰۷ء۔

۲. (page.6.7- A discriptive catalogue of the persian manuscripts (History) Vol.1. Arabic and persian research institute Rajasthan, Tonk, 1989.)

۳. صفحہ،۶۷۔ شمارۂ فہرست،۱۶۱۔فہرست نسخہ ہای خطی فارسی وعربی،جلد چہارم،کتابخانہ پالن پور،مرکز میکروفیلم نور،ایران ودھلی،۲۰۰۱ء)۔

۴. کتابخانہ رامپور رضا خان،اُتر پردیش۔مخطوطات فارسی۔

.۵(page.659- Concise descriptive catalogue of the persian manuscripts. Asiatic society of Bengal, Calcutta. Published in sept. 1924.)

.۶ (See page.194,195. Catalogue of the persian manuscripts, Vol.9. Khuda Bakhsh oriental public library, Patna, Bihar.)

۷. صفحہ،۱۲۰، فہرست نسخہای خطی فارسی (شمارۂ چہارم)،کتابخانہ جامعہ ہمدرد،دہلی نو۔

۸. صفحہ،۱۲۷،۱۲۸، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی،(شمارۂ پنجم) کتابخانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

۹. صفحہ،۲۶ شمارۂ فہرست ،۳۵۳۳۔۔فہرست مشروح مخطوطات فارسی،جلد نہم،کتابخانہ سالار جنگ حیدرآباد،طبع اوّل۔۱۹۸۸ء۔

۱۰. صفحہ،۲۶۔شمارۂ فہرست،۳۵۳۴۔ایضاً۔

۱۱. صفحہ،۲۷۔ شمارۂ فہرست،۳۵۳۵۔ایضاً۔

۱۲. صفحہ،۲۷۔شمارۂ فہرست،۳۵۳۶۔ایضاً۔

۱۳. صفحہ،۲۷،۲۸۔ شمارۂ فہرست،۳۵۳۷۔ایضاً۔

۱۴. صفحہ،۲۸۔شمارۂ فہرست،۳۵۳۸۔ ایضاً۔

۱۵. (source,Website-http/www.Indra Gandhi Centre for Arts/online catalogue/manusripts)

۱۶. (Source.Website-http/www.jammu and kashmir academy of Art,culture and languages/online catalogue/manusripts)

رفتید ولی نه از دل ما

سیدہ عصمت جہاں (ڈاکٹر)
شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،
حیدرآباد

شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد دکن ہمیشہ ہی سے تہذیب وتمدن، علم وادب کا گہوارہ اور ایک انفرادی فرھنگ وثقافت کا مرکز رہا ہے۔ جو لوگ دوسرے مقامات سے یہاں آتے ہیں یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور جن کو لوٹنا پڑتا ہے وہ بھی اس سے متاثر ہو کر اور اس کے علم وفضل کے خزانوں سے مستفید ہوئے بغیر نہیں لوٹتے غرض یہ شہر سلطان قلی قطب شاہ سے نظام آصفجاہ ہفتم تک اپنی خاص گنگا جمنی تہذیب اور اپنی بیش بہا علمی وادبی خصوصیات کی بناء پر ہمیشہ ممتاز وسربلند رہا ہے۔ حیدرآباد دکن میں فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں جامعہ عثمانیہ شعبہ فارسی کے اساتذہ کرام کا بہت اہم رول رہا ہے انہوں نے نہ صرف شہر حیدرآباد میں فارسی کی شمع کو روشن رکھا بلکہ اپنی گراں قدر تخلیقات تحقیقات ونگارشات کے ذریعہ فارسی ادبیات کے دامن کو وسیع تر کیا۔ ان اساتذہ میں علامہ اشرف شمسی، پروفیسر قاری، سید کلیم اللہ حسینی، پروفیسر نظام الدین، پروفیسر غلام دستگیر رشید، پروفیسر رضیہ اکبر، پروفیسر شریف النساء انصاری، پروفیسر سیدہ بشیر النساء بیگم، پروفیسر یعقوب عمر، پروفیسر زیب النساء حیدر، پروفیسر رفیق فاطمہ، پروفیسر نجمہ صدیقہ اور پروفیسر سید محمد تنویر الدین خدانمائی کے نام نمایاں ہیں۔ بے شائبہ دکن کے فارسی ادب کی تاریخ میں ان کے اسمائے گرامی ہمیشہ سنہری حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ جامعہ عثمانیہ شعبہ فارسی کے تین ممتاز وشفق اساتذہ پروفیسر بشر النساء بیگم، پروفیسر زیب حیدر، اور پدم شری شریف النساء انصاری بہت ہی مختصر عرصہ میں ہم سے جدا ہوگئی، اہل دکن کے لئے عموماً اور دنیائے فارسی کے لئے خصوصاً ان تین عظیم ہستیوں کا یوں مختصر وقفہ سے ہم سے رخصت ہو جانا کوئی سانحہ سے کم نہیں۔ ان اساتذہ کرام کے مختصر احوال وآثار ملاحظہ ہوں:

پدم شری پروفیسر شریف النساء انصاری:

پدم شری پروفیسر شریف النساء انصاری بتاریخ 16 راگست 1938ء بمقام حیدرآباد تولد ہوئیں۔ آپ کے والد کا اسم گرامی محمد معین الدین خان تھا۔ آپ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ آپ نے ویمنس کالج کوٹھی سے فارسی میں B.A. بدرجہ امتیاز کامیاب کیا پھر جامعہ عثمانیہ سے 1954ء میں M.A. فارسی بھی بدرجہ امتیاز کامیاب کیا۔ اسی جامعہ کے شعبہ اردو سے M.A. کیا اسی دوران آپ کو اردو کے ممتاز اساتذہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر عبدالقادر سروری سے شرف تلمذ حاصل رہا، 1957ء میں آپ نے پروفیسر قاری سید کلیم اللہ حسینی کی زیر نگرانی Ph.d کا مقالہ ''حیات وتصانیف ابو طالب کلیم ہمدانی'' کے عنوان سے لکھا اور اس طرح آپ جامعہ عثمانیہ کی تاریخ میں فارسی کی پہلی Phd. حاصل کرنے والی خاتون قرار پائیں، اور آپ اسی سال شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ میں لکچرر مقرر ہوگئیں۔ 1963ء

میں آپ ریڈر ہوئیں اور 1977ء میں ایران جا کر تہران یونیورسٹی سے اعلیٰ ترین ڈگری ڈی لٹ حاصل کی اور اس طرح سے فارن اسٹوڈنٹ ڈپارٹمنٹ کے قیام کے بعد ایرانی ڈی لٹ حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہونے کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔ 1983ء میں آپ پروفیسر ہوئی اور 1988ء میں صدر شعبہ فارسی کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ 1989ء میں U.G.C. کی جانب سے Professor EMetritus ہوئیں، آپ تمام عمر فارسی زبان و ادب کی ترویج کے لئے کوشاں رہیں چنانچہ دوران ملازمت آپ نے کئی قومی اور بین الاقوامی سمینارس کروائے۔ 1984ء میں فارسی کے فروغ میں دکن کا حصہ کے عنوان سے 1985ء میں سعدی شیرازی پر اور 1985ء میں انجمن استادان فارسی ہند کی ساتویں کانفرنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں منعقد کروائیں۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ میں جدید فارسی کے جونیئر اور سینئر ڈپلوما کا بھی آغاز کیا اور حیدرآباد کے کئی جونیئر کالجوں میں فارسی کو متعارف کروایا۔ 1983ء میں آپ نے فارسی کی ترویج کے لئے ایک اسوسی ایشن Assosiation for the prmotion of persion language and litrature کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی نیشنل اور انٹرنیشنل سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور فارسی ادبیات سے متعلق پُرمغز مقالے پیش کئے۔ آپ کی رہبری ونگرانی میں تقریباً 10 M.Phil. اور 5 Phd. کے مقالے فارسی کی مختلف قدیم وجدید جہتوں پر لکھے گئے ہیں۔ آپ کے کئی، تحقیقی، تنقیدی ومعلوماتی مقالے مختلف مجلوں، جیسے مجلّہ عثمانیہ، قند پارسی Indo-Iranica دانش، وحید (تہران) بیاض سب رس وغیرہ میں شائع ہوئے۔ سال 76-1975ء میں آپ ہندوستانی سفیر برائے ایران کی مترجم بھی رہیں۔ پدم شری شریف النساء انصاری نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کے لئے بھی وقت نکالا اور حسب ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱۔ حیات وتصانیف کلیم ہمدانی 1961ء	۲۔ دیوان کلیم ہمدانی 1963ء
۳۔ حدائق السلاطین 1983ء	۴۔ تاریخ علی عادل شاہی 1999ء
۵۔ سیر الھند (انگریزی ایڈیشن) 1999ء	۶۔ تحفہ عاشقان 2009ء
۷۔ شاہنامہ کلیم 2013ء وغیرہ	

فارسی ادبیات کے تئیں آپ کی اپنی غیر معمولی خدمات وکاوشوں کے اعتراف میں حکومت ہند نے 1988ء میں آپ کو باوقار ''پریسیڈنٹ ایوارڈ'' اور 1991ء میں اعلیٰ ترین ایوارڈ ''پدم شری'' سے نوازا۔ 2002ء میں حکومت ایران کی جانب سے ''سند'' عطا ہوئی 2005ء میں انجمن استادان فارسی ھند کی جانب سے ''استاد ممتاز'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ سادگی کا پیکر، سنجیدگی ومتانت کی مدات، غرور وتکبر سے کوسوں دور، غیر معمولی علمیت، قابلیت، لیاقت وصلاحیت کی حامل فارسی کی ایک عظیم خدمت گزار یعنی پدم شری پروفیسر شرفی النساء انصاری بروز جمعہ 4/ مارچ 2015ء مطابق بہ ۱۴/ جمادی الاول ۱۴۳۶ھجری ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئیں۔ لیکن فارسی زبان وادب کے تئیں آپ کی گراں قدر خدمات اور آپ کے گرانبہا آثار دنیائے فارسی کو ہمیشہ آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔

پروفیسر سیدہ بشیر النساء بیگم :

پروفیسر سیدہ بشیر النساء بیگم 1942ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئی آپ کے والد کا اسم گرامی سید جمیل الدین تھا۔ آپ نے ویمنس کالج کوٹھی سے گراجویشن پھر جامعہ عثمانیہ سے فارسی میں .M.A کیا۔ 1988ء میں آپ نے پروفیسر شریف النساء انصاری کے زیر نگرانی Phd مقالہ بعنوان ''تصحیح وتحشیہ احکام عالمگیری'' لکھا اور اسی سال شعبہ فارسی میں لکچرر منتخب ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے ایران کا سفر کیا اور وہاں سے ماڈرن پرشین میں ڈپلوما کیا۔ سال 2000ء می آپ بحیثیت صدر شعبہ فارسی ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ آپ کے تصانیف میں:

۱۔ جوی شیر ۲۔ رگ تاگ ۳۔ شب وروز مسلمان
۴۔ ھدیہ تحقیق ۵۔ تاریخ ادبیات فارسی درزمانہ تیموریہ ھند
۶۔ مؤرخین فارسی نویس در دکن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر سیدہ بشیر النساء بیگم کو سال 2000ء میں حکومت ھند کی جانب سے باوقار پریسیڈنٹ ایوارڈ اور حکومت ایران کی جانب سے سعدی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر سیدہ بشیر النساء بیگم ۲۰ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھجری مطابق بہ 27 ستمبر 2013ء ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئیں۔

پروفیسر زیب النساء حیدر:

پروفیسر زیب النساء حیدر 1940ء میں پیدا ہوئی۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید محمد خان تھا۔ آپ نے ویمنس کالج کوٹھی سے .B.A پھر جامعہ عثمانیہ سے پہلے فارسی سے پھر اردو میں .M.A کیا۔ آپ نے سنگاریڈی کالج اور محبوبیہ کالج میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد پروفیسر شریف النساء انصاری کے زیر نگارنی Phd مقالہ بعنوان ''دارالانشا نظام میر نظام علی خان'' لکھا اور شعبہ فارسی میں استاد مقرر ہوئیں 2002ء میں آپ ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ آپ کی تصانیف میں:

۱۔ تاریخ دکن کے چند گوشے 1994ء ۲۔ تواریخ آصفجاہی (انگریزی ترجمہ) 1994ء
۳۔ ارمغان ھند وایران 1996ء ۴۔ بحر تحقیق 2001ء
۵۔ دارالانشا نظام (انگریزی) 2002ء ۶۔ افکار وآثار 2008ء

1999ء میں حکومت ھند کی جانب سے آپ کو باوقار پریسیڈنٹ ایوارڈ اور حکومت ایران کی جانب سے امام خمینی ایوارڈ اور 2008ء میں جائزہ سعدی سے نوازا گیا۔ پروفیسر زیب حیدر بتاریخ ۱۲ صفر ۱۴۳۵ھجری مطابق بہ 16 ڈسمبر 2013ء اپنے مالک حقیقی سے جاملیں۔ فارسی زبان وادب کی ان تین عظیم ہستیوں کے یوں یک کے بعد دیگرے چلے جانے سے دنیائے فارسی میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کا پر ہونا محال ہے۔ ایسے ہی لوگ اپنے زبان حال سے کہہ جاتے ہیں کہ:

''ڈھونڈو گے ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم''۔

آئینۂ تحقیق

اس کالم کے تحت پچھلے شمارے میں علی گڑھ مسلم کے شعبۂ فارسی میں پایہ تکمیل کو پہنچے والے تحقیقی مقالات کی فہرست پیش کی گئی تھی۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس مرتبہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پایۂ تکمیل کو پہنچنے والے تحقیقی مقالات کی فہرست پیش کی جارہی ہے جو یونیورسٹی کے تھیسس سیکشن کے کیٹلاگ کے مطابق ہو بہ ہو بہ اعتبار نمبر شمار نقل کی گئی ہے۔ (مدیر)

پایان نامۂ شعبۂ فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

عابدہ خاتون
ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی و فارسی،
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

نمبر شمار	کیٹلاگ نمبر	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	نگراں	سن
۱	179	Fazi: The Poet with Geeta	ہریشور دیال	پروفیسر زبیر احمد	1954
۲	467	Development of Persian Masnavi	رغیب حسین	پروفیسر زبیر احمد	1954
۳	825	مجموعۂ دانش از منشی کشور داس دیسائی	سید مقبول احمد	پروفیسر سعید حسن	1959
۴	1765	French Infuence on Modenr Persian Language	عبدالقادر جعفری	پروفیسر محمد رفیق	1974`
۵	2190	سہم فارسی محمد اجمل الہ آبادی در تحول ادب فارسی	سید اختر مہدی	پروفیسر محمد رفیق	1977
۶	3010	مطالعۂ انتقادی از شعر فارسی دکتر محمد اقبال	عبدالقادر جعفری	پروفیسر محمد رفیق	1982

۷	5416	Jalaluddin Dawwani and His Ethics	احمد اشفاق	عبداللطیف الہندی	1989
۸	5759	Ghani Kashmiri: A Persian Poet of Repute	صالحہ رشید	پروفیسر عبدالقادر جعفری	1995
۹		مطالعہ انتقادی از شعر بہار	شبیر احمد	پروفیسر عبدالقادر جعفری	2001
۱۰	7099	تحول نثر فارسی در دورۂ غلامان ہند	شبانہ عزیز	پروفیسر عبدالقادر جعفری	2003
۱۱	8380	پروین اعتصامی شاعرہ معروف فارسی	زیبا اعظمی	پروفیسر عبدالقادر جعفری	2008
۱۲	8868	امام خمینی شاعر معروف	زینت رضا	دکتر صالحہ رشید	2010
۱۳	8869	مطالعہ رباعیات باباطاہر و عمر خیام	تبسم جہان	دکتر صالحہ رشید	2010

☆☆☆

چشم بینش

تصنیف: شرح انتخاب قصائد خاقانی
مصنفہ: پروفیسر (خانم) شمیم اختر
صفحات: ۱۶۰
قیمت: ۱۵۰ روپئے
ملنے کا پتہ: B3/F1، میرا کالونی، بی ایچ یو، وارانسی
مبصر: نوید یاسر

مذکورہ تصنیف کی مصنفہ معروف محقق پروفیسر (خانم) شمیم اختر، صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی ہیں۔ ان کا وطنی تعلق بھی بنارس سے ہی ہے۔ موصوفہ کے دیگر آثار میں بوستان ادب (فارسی)، اوراق پریشان (مجموعۂ مقالات)، شیخ علی حزیں حیات اور کارنامے، عرفان در غزلیات حزیں، تحفۃ الاحباب بنارس وغیرہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ بنارس فارسی مثنویات کی روشنی میں اور بنارس میں فارسی ادب (راجہ چیت سنگھ تک) زیر طبع ہیں جن کے بارے میں یہ امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہی وہ شایقین ادب کے ہاتھوں میں ہوں گی۔ علاوہ ازیں موصوفہ کے گراں بہا مقالات ملک و بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اور خود بھی قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کرتی ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے موصوفہ نے اپنی تمام دلچسپیوں کو قلم و قرطاس کے لئے وقف کر دیا ہے۔ جس کا اعتراف حال ہی میں انہیں صدر جمہوریہ جیسے اعزاز سے نواز کر کیا گیا ہے۔

''شرح انتخاب قصائد خاقانی'' جیسا کہ اس کے عنوان سے عیاں ہے کہ خاقانی شروانی کے اہم قصائد کی شرح ہے۔ ''پیش لفظ'' میں محترمہ نے فن قصیدہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور دوسرے باب ''خاقانی شروانی'' کے عنوان کے تحت شاعر کے احوال و کوائف بڑے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ''خصوصیات قصائد خاقانی'' ہے جس میں انہوں نے فن قصیدہ نگاری کے امام کے کلام کی خصوصیات کو نہایت جامع و مانع انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد قصائد ''در نعت سرور کائنات ﷺ''، ''در تعریف خاک پاک ﷺ''، ''قصیدہ''، ''قصیدہ در صفت صبح و تعریف مکہ و صفت بہار و مناظر طیور ع نعت ﷺ''، ''قصیدہ نعتیہ''، ''در شکایت زندان و شدائد آن و نعت صلعم''، ''در عزلت و قناعت و ترک طمع''، ''در مدح نصرۃ الدین قزل ارسلان''، ''ایوان مدائن'' کی بہترین لفظی و معنوی شرح لکھی ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے خاقانی کے تقریباً تمام اہم قصائد کی شرح لکھ کر اساتذہ و طالب علموں دونوں کے لئے جہاں ایک طرف فارسی ادب اور خاقانی جیسے شاعر کی شاعری کو سمجھنے کے نہایت آسانی فراہم کی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس اہم میدان پر اپنے اشہب قلم کی روانی سے فارسی ادب میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ مسلسل بیماری اور کمزوری کے باوجود ان کی گوناگوں علمی مصروفیات کو دیکھ کر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ بنارس جیسے علمی مرکز سے اہل ادب کو کئی علمی تحفے حاصل ہوں گے۔

Quaterly Literary Research Journal ISSN- 2394-5567

DABEER

(An International Peer Revieved Refereed Journal For Persian Literature)

VOL. II, ISSUE II APRIL TO JUNE 2015

From:- Dabeer Hasan Memorial Liberary, Kakori, Lucknow, U.P., India-226101

Email:- **dabeerpersian@rediffmail.com**

Mob. no:- 09410478973

Founder:- **Professsor Umar Kamaluddin Kakorvi,** LU, Lucknow.

Chief Supervisor:- **Dr. S. M. Asghar Abidi**, AMU, Aligarh.

Supervisor:- **Dr. Anjuman Bano Siddiqui,** Lucknow.

Editor:- **Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder,** Research Scholar, Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh

Editorial Board:-

Professor Syed Hasan Abbas, Persian, BHU, Varanasi.

Professor S M A Khursheed, Persian, AMU, Aligarh.

Dr. Aleem Asharaf Khan, Persian, DU, Delhi.

Dr. Mazhar Alam Siddiqui, Persian, Ismail Yusuf College, Mumbai.

Dr. Muhammad Aqeel, Persian, BHU, Varanasi, India

Dr. Muhammad Qamar Alam, Persian, AMU, Aligarh.

Zunnoorain Haider Alavi, Editor Bi-Annual **TASFIYA**, Kakori, Lucknow.

Naqi Abbas Kaifi, Editor Quaterly **NAQD-O-TAHQEEQ**, New Delhi.

Arman Ahmad, Editor Quaterly **IRFAN**, Chapra, Bihar.

Co-Editors:-

Mohammad tauseef, AMU, Aligarh

Munazir Haque, AMU, Aligarh

Muhammahd Anas, AMU, Aligarh

Asharf Ali, AMU, Aligarh

Mohammad Jafar, JNU, Delhi

Atifa Jamal, Lucknow

Muhammad Hasan, AMU.

Sarim Abbas, AMU, Aligarh

Rajesh Sarkar, BHU, Varanasi

Saduddeen, AMU, Aligarh

REVIEW COMITTEE

Professor Azarmi Dukht Safavi, Director IPR, AMU, ALigarh.

Professor Shareef Hussain Qasmi, Ex-Dean, F/Arts, DU, Delhi,

Prof. Abu Musa Muhammad Arif Billah, Al Biruni Faundation, Dhaka.

Professor Abdul Qadir Jafery, HOD Arbic & Persian, Allahabad University.

Dr. Najm ul Rasheed, Persian, Punjab University, Lahore.

Advisory Board:-

Professor Ziyauddin Ahmad Shakeb Kakorvi, London.

Professor Panna Lal, HOD History, Allahabad University, Allahabad.

Professor Ram Sumer Yadav, Dept. of Sansikrit, LU, Lucknow

Professor Musheer Hussain Siddiqui, HOD Arabic, LU, Lucknow

Dr. Gulfihsa Khan, Dept of History, AMU, Aligarh.

Dr, Ata Khursheed, MA Liberary, AMU Aligarh.

Dr. Pradeep Jain, Allahabad.

Dr.(Ms.) Berna Karagözoglu, Agri Ibrahim Çeçen University, Turkey.

Dr. Iftikhar Ahmad, M A College, Colcata.

Dr. Fakhre Alam Azmi, KMCUAFU, Lucknow.

Dr. Arshad Qadiri, Lucknow University, Lucknow

Dr. Sakina Khan, Department of Persian, MU, Mumbai

Dr. Shahram Sarmadi, Tehran, Iran.

Dr. Prashant Keshavmurthy, Macgill University, Montreal, Canada

Inci Celikel, Anatoliya Univerity, Turky.

Index

1	An Introduction of Persian Festivals		
		Berna Karagozoglu	4
2-	A Critique of Marxism: Ali Shariati		
		Sarim Abbas	15
3-	A Glance at: Ahmad Gulchin-i-Maani's Life and works(1)		
		S. Naqi Abbas (Kaifi)	19
4-	The story of Nal-Damyanti in Persian literature		
		Rajesh Sarkar	23
3-	Scientific & Technical Exchange Between India & Iran		
		Rakesh Vij	33
5-	Jahan-e-Urdu		
		Munazir Haque	37

AN INTRODUCTION OF PERSIAN FESTIVALS

Ms. Berna Karagözglu (Dr.)
Assistant Professor of Persian
Agri Ibrahim Çeçen University,Turkey

ABSTRACT:

The study of ancient Iranian culture and customs in which we find all Iranians celebrate several Zorastrian festivals throughout the year at the different occassion despite of being an Islamic country and community but we are only familiar with their most famous Zorastrian festival 'Navrooz' while others are not known to us like 'Shabe-e-Yalda, Chaharshambe Suri, Jashn-e-Mehregan etc.but they are also having a very important role in Iranian society, culture as well as in Persian literature also. So, the aim of the article is to have an brief introduction of the festivals remaining since the Zorastrian Iran till today's Islamic Iran.

Key Words: Iranian festivals, Traditions of Iranians, Festivals, Zorastrian festivals.

Article:

Due to its multi-cultural status, Iran has many religious festivals throughout the year. Many of the festivals manage to combine various influences from each of the diverse cultures.

Cultural celebrations are common to the people of all over the world. Festivals are mostly celebrated to propagate the cultural heritage of nations. Festivals at national level help to promote solidarity and patriotic spirit in the society. Religious festivals all around the world bring convergence and propagate acceptance of all kinds of religions in different geographical segments.

Zoroastrians believe they must fight evil through good deeds, words, and thoughts, including charity and service. Fire plays a central role in their worship as a symbol of truth and the spirit of God. Prayer is often performed in front of a fire which is called the 'holy fire(1). Here we take a look to the festivals which are remaining since the Zorastrian era till today's Islamic Iran.

☆ **SHAB-E-YALDÃ:**

The Syriac Aramaic word 'yaldaa' literally means re-birth and has been used to denote the longest night of the year for the sun's rebirth. It's the longest night of the year.

While Christians around the world are preparing to celebrate Christmas on 25th December, the Persians are getting ready to tribute one of their most festive celebrations on 21th December. 21 December, (equivalent to the 30th day of the Azar month) the eve of winter solstice, the longest night and shortest day of the year. Mehr or Mithra, meaning love and sun, and has been celebrated by the followers of Mithraism as early as 5000 B.C(2)

Ancient Zoroastrians used to believe that "AHURA MAZDA" (the good God) created light, days and sunshine as representations of order. The day is a time of work, harvest and productivity. They also used to believe that "AHRIMAN" (an equally powerful, but evil God) created "the night', a time of darkness, cold, hidden secrets and wild predators.

Iranians celebrate 'yaldaa' like many rituals. This celebration is one of the biggest original Persian festivities and after the discovery of fire, the celebrations became more colourful and celebrating with the grooming lights. Fires and lights, symbols of 'Ahura Mazda', warmth and lasting life have always been associated with the winter festival. To remain safe from Ahr?man's harms, in the evening of 'Shab-e-yaldaa' bonfires are lit outside, while inside family and friends gather in a nightlong vigil around the Korsee, a low, square table covered with a thick quilt overhanging on all sides.

Festivities and rituals at the occassion of Yalda are symbolized by the evergreen tree. Young girls wrapped their wishes in silk cloth and hung them on the tree. All foods have symbolic aspects of Yalda night as a sign of blessing, Iranians believed that eating fruits like pomegranate and watermelon seed filling mean to increase the powers of fertility of their fields.

The oldest member of the family says prayers, asks sun "yazat" to bless them, thanks to God for the previous year's crops, and prays for the prosperity of next year's harvest. Then with a sharp knife, he or she cuts through a thick yogurt or watermelon, giving everyone a share. The cutting

symbolizes the removal of sickness and pain from the family(3).

Eating watermelon because it was customary in all parts of Iran, Because they believed that eating watermelon at night keeps them warm in winter, cold and disease does not overcome and in summer they do not feel thirsty(4).

Mixture of nuts literally means night-grazing; eating nuts is said to lead to prosperity in days to come. More substantial fare for the night's feast include eggplant stew with plain saffron-flavored rice, rice with chicken, thick yogurt, and halva (saffron and carrot brownies).

☆ **SÃDEH:**

Jashn-e-Sadeh is a mid-winter celebration, commemorated since antiquity in Iran, then Persia to non-Iranians, that falls twenty days after Shab-e-Yalda, the winter solstice. The figure Sad-eh i.e. one hundred, actually coincides with 100 days before the arrival of Navrooz, i.e., the vernal equinox(5).

According to religious belief, Jashn-e-Sadeh recalls the importance of light, fire and positive energy; light which comes from God is found in the hearts of God's creatures.

In Sassanid Dynasty era (7th century C.E.),huge bonfires were set up at Sadeh. For Zoroastrians the chief preparation for Sadeh was and still in some parts is the gathering of wood the day before the festiva(6)l.

During ancient times, the fires were always set near water and the temples. The fire originally meant to assist the revival of sun and bring back the warmth and light of summer. It was also meant to drive off the demons of frost and cold, which turned water to ice, and thus could kill the roots of plants.

☆ **CHAHÃR SHANBE SÛRI:**

In the evening of the Wednesday before Navrooz (last Wednesday of the year), the Iranians celebrate Chahar Shanbeh Suri. The word Chahar Shanbeh means the Wednesday and Suri means the red. The festivities and celebration start since the early evening(7). It serves as a cultural festival for all Iranian Jews, Muslims, Armenians, Turks and Zoroastrians alike.

During the night of Chahar Shanbe Suri people traditionally gather and light small bonfires in the streets and jump over the flames shouting: "Zardie man az to, sorkhie to az man" in Persian, which means,"Give me your beautiful red color and take back my sickly pallor!" With the help of fire and light symbols of good, people hope to see their way through the unlucky night - the end of the year- to the arrival of springs longer days.

Traditionally, it is believed that the spirits of their ancestors roam around and visit home at this last Wednesday of the year. Many people specially children, wrap themselves in shrouds symbolically re enacting the visits.

By the light of the bonfire, they run through the streets banging on pots and pans with spoons (Gashog-Zani) to beat out the last unlucky Wednesday of the year, while they knock on doors to ask for treats. In order to make wishes come true, it is customary to prepare special foods and distribute them on this night. Noodle Soup a filled Persian delight, and mixture of seven dried nuts and fruits, pistachios, roasted chic peas, almond, hazelnuts, figs, apricots, and raisins(8) or seven well-known crops, familiar to the Persians prior to the advent of Islam and the Arab domination.

Families return home after the event of 'Chahar Shanbe Suri' and wait together eagerly for coming the 'Navrooz' i.e. now the countdown of 'Navrooz' starts after the celebration of 'Chaharshambe Suri'.

☆ **NAVROOZ:**

Navrooz literary mean 'the new day' is celebrated by the Iranian people and the related cultural continent and has spread in many other parts of the world, including parts of Central Asia, Caucasus, South Asia, Northwestern China, the Crimea and some groups in the Balkans. This occasion, celebrated on 21st March, Navrooz marks the first day of the spring and the beginning of the new and fresh year in the Iranian calendar. There exists many legends and myths behind this most important Persian festvial. It is also known as Newruz, Nu Roz ceremonies are symbolic representations of the ancient concept of the "End and the Rebirth."

According to Persian mythology, God created the world, man and the

sun on this day. Kiyumers, the legendary Persian king , declared this day to be a festival when he ascends the throne. Jamshid, the symbol of magnificence in Persia , also ascended the throne on this day. In addition, Jem, the seventh grandson of the Prophet Adam, came to Azerbaijan on 21st March and declared it to be a day of celebration(9).

Navrooz as being a Zoroastrian holiday and having significance amongst the Zoroastrian ancestors of modern Iranians, it is celebrated in some parts of the South Asian sub-continent as the new year at the same time.

Navrooz means for an Iranian is free of any official or religious rituals, although as the official New Year and time for family and friends together and celebrate the end of running year and the beginning of the forthcoming year.

Children have holiday leaves for fourteen-days from schools, and most adults do not work during the Navrooz festivities and youngers go to the elders home to greet and then elders come to youngers home to re greet them.

Preparation to celebrate Navrooz starts a few weeks before it reaches with a traditional spring cleaning and re-arranging the home. Every member of an Iranian family buys new clothes, Iranians bake pastries and germinate seeds as sign of renewal. The ceremonial cloth is set up in each household. Just like other cultural celebrations, many special foods are prepared during Navrooz. One of these dishes, "Aash-e Resteh" or noodle soup, is typically served on the first day of Navrooz. This soup is special because the knots of noodles symbolize the many possibilities in one's life, and it is thought that untangling the noodles will bring good fortune.

Another Navrooz special dish is called "Sabzi-Pulo-Mahi" (in this fish is served with a special rice mixed with green herbs). The rice is made with many green herbs and spices, which represents the greenness of nature at spring. Special sweets are also served during Navrooz.

Vital traditional celebrating items include "Naan-e-Berenji" (cookies made from rice flour), "Baqlava" (flaky pastry sweetened with rosewater, "Samanu" (sprouted wheat pudding); and "Noghl" (sugar-coated almonds).

Some Navrooz celebrants believe that whatever a person does on Navrooz will affect the rest of the year. So, if a person is warm and kind to

their relatives, friends and neighbors on Navrooz, the new year will be a good one. On the other hand, if there are fights and disagreements, the year will be a bad one. As an extended tradition to the holiday, men may or may not choose to shave their faces until the night of the "New Day" as a sign of removal of old habits and tendencies and the rebirth of their faith and being.

☆ **HÃJI FIROOZ & AMOO NAVROOZ:**

'Haji Firooz' is symbol of happiness, he has a red dress and red hat and black face, he dances and sings in the streets and do funny things to amuse. 'Amoo Norooz', a distant relative of 'Haji Firooz' is responsible for giving gifts to children and very much like to be Santa Claus at the ocassion of Christmas. 'Haji firooz' tells stories to childeren and ensures that they are happy and healthy for many years to come(10).

☆ **HAFT SEEN:**

The most important activity in the celebration of 'Navrooz' is the making the 'Haft Seen' table. 'Haft' is the Persian word for the number 'seven' and 'Seen' is as well the Persian word for the letter 'S'. Literally, the 'Haft Seen' table means a "table of seven things that start with the letter S". Creating the 'Haft Seen' table is a family activity that begins by spreading a special family cloth on the table. Next the table is set with the seven 'S' items. Here are some of the items and what they symbolize(11).

* **Sumac (crushed spice of berries)**: for the sunrise and the spice of life.
* **Senjed (sweet dry fruit of the lotus tree):** for love and affection.
* **Serkeh (vinegar):** for patience and age.
* **Seeb (apples):** for health and beauty.
* **Sir (garlic):** for good health.
* **Samanu (wheat pudding):** for fertility and the sweetness of life.
* **Sabzeh (sprouted wheat grass):** for rebirth and renewal of nature.

Al-Biruni said: "Haft Seen came from Jamshid because he destroyed the evil that made Pars lands weak, so in the first day of Iranian calendar people called it "Navruz" (starting of a new day) and they put 7 different beans on their table as a sign of thanking nature for giving humans all what they

need. Since then every year Iranians put 'Haft Seen' on their tables, but nowadays they put 7 things that start with letter [س]. Some people also believe that Sasanian had a very beautiful plate that was given to them from China and they called it "Chini plate", and after some years the word "Chini" changed into "Sini" (a beautiful plate); so people would put 7 things in a "Sini"(12).

In addition to these 'S' items, there are other symbolic items that go on the 'Haft-Seen' table, depending on the tradition of each family. It is customary to place a mirror on the table to symbolize reflection on the past year, an orange in a bowl of water to symbolize the Earth, a bowl of real goldfish to symbolize new life, colorfull eggs to represent fertility, coins for prosperity in the New Year, special flowers called 'hyacinths' to symbolize spring and candles to radiate light and happiness. Each family places other items on the table that are special, for example the 'Qur'an', the holy book of Islam, or the 'Shahnameh', the national epic of Iran narrating the colourful stories of Persian kings and Zorastrian Iran written around the year 1000 CE by the great 'Firdousi'(13).

Another important item to place on the 'Haft-Seen' table is 'Divan-e-Hafez' ,a collection of the poems of the great and famous poet 'Shams ud-Din Hafez'. Hafez lived in Persian lands during the 14th Century CE and wrote around great poems in ghazal form. Many Persians consider 'Hafez' to be Iran's national poet for his historical status. The 'Haft-Seen' table remains in the family home for thirteen days after the beginning of 'Navrooz'.

☆ **SIZDEH BE DAR:**

The thirteenth day since starting the 'Navrooz' is called 'Sizdeh Be Dar', which literally means in Persian "getting rid of the thirteenth." 'Al-Biruni' also called this day: tir ruz: blissed day(14). The celebrations that take place on 'Sizdeh Be Dar' are just as festive as those on the first day of 'Navrooz'. On this day, families pack a special picnic and go to the park to enjoy food, singing and dancing. It is customary to bring new sprouts, or sabzeh, grown especially for this occasion. At the park, the green blades of the sabzeh are thrown on the ground or in a nearby river or lake to symbolize the

return of the plant to nature.

'Sizdeh Be dar' marks the end of the 'Navrooz' celebrations, and the next day children begin to go school and adults to their jobs after a long, celebrating and fresh vacation.

☆ **MEHREGÃN:**

In the Zorastrian Religious Calendar, the 'Mehregan' festival is celebrated on the 16th day of the 7th month (Mehr) at the time when the harvest is ready and the time is to start winter.

Mehregan, Mihregan or Mehrigan is the second most significant Persian (Iranian) festival after 'Navrooz' dating back over 3000 years(15). Iranian - Zoroastrians all over Iran, particularly, in Yazd and Kerman provinces have continued to celebrate Mehregan in an elaborate fashion, very similar to 'Navrooz' for centuries.There are many accounts,legends & myths associated with the beginning of the festival 'Mehrgan'. Avestan texts divide the Iranian year into two equal parts or seasons. The first season being the summer and the second one winter. The coming of the two seasons would be celebrated through, 'Navrooz' (spring equinox) and 'Mehregan' (autumn equinox)(16).

The ancient Iranians considered 'Mehr' was responsible for love and friendship, contracts and covenants, and a representation for light. Later, Mehr was also began to be considered as a symbol of the sun. There again, Mehr was considered to be a god of heroism and warfare(17). At this occassion seven types of fruits are seen at the table of the 'Mehregan' celebrating family which are usually Pomegranate, Apple, Grapes, Pear, Senjed (fruit of the lotus tree), Quince and Citron. There is also a mixture of special nuts at this table. There are some grains such as: peas, beans, lentils and chickling vetch to symbolize last year's harvest and next year's plan. During 'Mehregan' all families join together for observance and pray.

Roasted mutton is this day's special dish. Some times this meal is distributed freely to all local people including the non-Zorastrians. Other kinds of food and delicacies are also prepared to be shared by all (including dogs, which are venerated amongst Zoroastrians). There are special cookies which

are prepared for this day and distributed in feast.

At the sunlight of first day of the festival people gather near the biggest spring of the village and prayers for dearly departed are performed. Then people go to village houses singing and dancing. The host of each house opens the house door for them and gives some Mehregan's nuts. The collected nuts are taken to the temple in each village and given to the person who keeps the fire burning in the temple, asking him to continue the fire until next year(18).

The greatest observance is the lighting of a huge bonfire outside of a temple just after the sunset(19). There are many references to Navrooz, Sadeh and Mehregan in Persian poetry.

☆ **SEPANDARMEZARGÃN:**

Sepandarmazgan is the love day and women cherish in Iranian culture. This festival is celebrated on the 29th day of the Bahman month of the Iranian calendar, which coincides with the month of mid-February of the Christian calendar(20).

Sepandarmaz is the national title for the earth that means the spread, holy and humble. Earth is a symbol of love, because it gives love to all with humbleness.

The custom dates back to the Zoroastrian tradition. According to the ancient Zorastration tradition, 'Sepandarmazgan' was observed in the Great Persian Empire in 20th century BC. It is also the national title of Earth, which is the symbol of love and modesty. Persians have a rich culture with many great feasts that are associated with happiness and joy. In the feast of 'Sepandarmazgan', the earth was worshiped and women were venerated. On this day, women and girls sat on a throne and men and boys had to obey them and present gifts. This custom reminded men to honor and respect women(21).

. Conclusion:

Iran is of great interest to a wide range of scientific disciplines because of the rich ethnic and cultural diversity of population living there.

The religious system founded by Zoroaster, believed to be a prophet

living in Persian lands in the sixth century BCE. It is recorded in the Avesta the ancient scriptures of Zorastrians,which teach the worship of a deity called 'Ahura Mazda'. One of the main principles of the religion is the universal struggle between the forces of light and darkness or good and evil. Many festivals are celebrated at the occassion when the harvest is ready to cut and this commemorate great historical figures and events, while many express devotion to the deities of different religions.

The real purpose of these celebrations and gatherings is to bring the mass close together and in touch. In Iran today despite of the advent of Islam and Muslim rituals, Shab-e-Yalda, Navrooz, Chahar Shanbe Suri, Sepandarmazgan, Mehregan,Sadeh, Sizdeh Be Dar are still celebrated widely. By studying the ancient Iranian customs and rituals the point can be realized that these festivals and the holidays during these festivals bring the family and the community together and the culture, rituals as well as traditional food, dance, music and handicrafts are introduced to the young generation by the veteran senior generations. The national and religious celebrations are important parts in Iranians lives. That is also the part of the Iranian spiritual heritage through research and study should be preserved.

Refrences:-

1- P- 1009, p- IX, Allies, Jaleh. Concise Encyclopedia of Iran.

2-http://www.iranchamber.com/culture/articles/persian_roots_christian_traditions.php Ramona Shashaani, Culture of Iran\ Borrowed Ideas; Persian Roots of Christian Traditions December 1999

3-http://www.iranchamber.com/culture/articles/persian_roots_christian_traditions.php

4- P- 39, Ancient rituals and celebrations in Iran.

5- P- 1009, p- XXI, Allies, Jaleh. Concise Encyclopedia of Iran.

6- Massoume Price (www.cultureofiran.com) & D. N. Rahni (www.DrRahni.com)

http://www.iranian.com/main/2011/dec/light-longest-night

7- http://www.elftown.com/_persian%20celebrations

8- P- 2016, page- 22, Dehkhoda, Ali Akbar, Nâme, 1966s

9- http://www.turkishculture.org/lifestyles/ceremonies/nevruz-221.htm
10- P-2052, page- 19, Dehkhoda, Ali Akbar, Nâme,Volume I
11- P-15-16, Days of culture.
12- P- 2089, page- 65,Dehkhoda, Ali Akbar, Nâme, Volume I
13- P-100-101, Knowledge of Persian culture.
14- P-211,Winter celebrations and rituals and beliefs.
15- P- 198, Winter celebrations and rituals and beliefs.
16- P-78, Knowledge of Persian culture.
17- P- 07, Days of culture.
18- P- 09, Ancient rituals and celebrations in Iran.
19- http://www.oshihan.org/Pages/MehrganE.htm by Massoumeh, Price The Joy of Mehrgan Festival
20- P- 30, Ancient rituals and celebrations in Iran.
21- p-57,Winter celebrations and rituals and beliefs.

Sources:

1:- Anjvshyrazy, Syed Qasim, Winter celebrations and rituals and beliefs, Amir Kabir Publications, Vol. II,200, Tehran, Iran.
2:- Anvari, Hasan, Days of culture,Tehran: Word2004.
3:- Dehkhoda, Ali Akbar, Nâme, Majjale Daneshgah-e-Tehran, Vol. I, 1966, Tehran, Iran.
4:- Razi, Hashem, Fire celebrations, Behcet, Tehran, Iran,2004.
5:- Razi, Hashem, Calendar and celebrations of ancient Persia, Behcet, Tehran, Iran,2002.
6:- Amini's, Mahmoud, Ancient rituals and celebrations in Iran, Agah, Tehran, Iran, 1998.
7:- Z. franchy, M., Habib, Knowledge of Persian culture,Saffar, Tehran, Iran,1992.
8:- Allies, Jaleh. Concise Encyclopedia of Iran, Tus Publications, Tehran, Iran, 2004.

☆☆☆

CRITIQUE OF MARXISM - ALI SHARIATI

Sarim Abbas (Dr.)
P.hd., Philosophy,
Aligarh Muslim University, Aligarh

Abstract

In this paper I deal with the Marxism as an unsuccessful experimenter which would be unable to liberate Iranian society. He advocated for an overhauled version of revolutionary Islam to be an ideological successor to Marxism. A retooled version of Islam was needed to succeed where Marxism appeared to have failed. His interpretation of Islam would be a post-Marxist revolutionary philosophy that was more authentic, and also had a greater chance of mobilizing class consciousness among working-class Muslims.

Ali Shariati (1933-77) was a dynamic Iranian thinker and a trained sociologist, having had his university education in France. He was an ideologue of the Iranian revolution under the leadership of Imam Khomeini during the 60s and 70s of the twentieth century.

Ali Shariati was one of the most important Muslim intellectuals. It is impossible to discuss left-wing formulations of Islam without him as well as revolutionary Islamism more broadly. As a sociologist of religion, Shariati grappled with many important issues facing social transformation in the Muslims' world. He was insightful enough about Islam's role in related movements that he is considered to be a major ideologue of the Islamic revolution.

As an Islamic scholar and thinker Ali Shariati was deeply committed to the establishment, institutionalization and implementation of the cultural, civilizational, socio-political, religious-ethical value and standards of Islam. His interpretation of Islam is totalistic or completionistic. His contention is that Islam can provide guidance in all spheres of human operations i.e. social, political, cultural, economic and educational and so on. His works stood for a theocratic socio-political order and deemed Islam to be a complete code of conduct.

The Iranian revolution has been, among other things, an implicit repudiation of Marxism as a revolutionary ideology and as a doctrine relevant to the problems of Iranian society or valid for humanity at large. In the West much was heard, during the course of the Iranian revolution, about "an unnatural alliance between Marxists and Muslims," which was bound to end with the Marxists' swallowing up the Muslims after the overthrow of the Shah. Events since the revolution itself have proven, however, how weak and ineffective the Iranian left really is. This situation is partly the results of the errors and even crimes committed over the years by various Marxist groups in Iran. But it is also the result of an ideological debate and confrontation that was carried on both in Iran and in the Iranian revolutionary Diasporas during the last decade or so of the Pahlavi dictatorship. The opposition of Muslim and Marxist is by no means over, either in Iran or elsewhere, but the Iranian revolution certainly shows the debate to be going in favor of the Muslims. A number of important and influential refutations of Marxism have helped to achieve this result. We should mention "lessons on Marxism" by Jalal ud-Din Farisi, "A Critical introduction to the theory of Dialectic Contraction" by Abdul-Karim Sarush, and the various writing by Ali Shariati, especially the present collection.

What distinguishes all of these books and sets them apart from most critiques of Marxism attempted elsewhere in the Islamic world, are (1) an intimate knowledge of Marxism, and its philosophical foundations and (2) the attempt to point out the logical contradictions within Marxism, instead of adducing scriptural arguments to underline the well-known differences between Islam and Marxism. Shariati is aided in his task of refutation by a thorough acquaintance with the predecessors of Marxism in European thoughts and the circumstances of intellectual history that have left an indelible Western stamp on the doctrine, despite its having been exported to the third world as a supposed means for combating the West. His critique of Marxism is situated, moreover, in the context of a coherent vision and statement of Islam as an ideology; it is plain that his strictures on Marxism are not motivated by mere negative animus. The combination of these factors

permits an analysis and refutation that are serene and self-assured as well as radical and uncompromising.

As a trained sociologist with a firm belief in the validity of the Islamic world-view and value-system shariati tried to respond to Marxian assumption so dominantly and pervading the French intellectual circles after Second World-War.

Shariati deems and defines Marx's to be a product to post-Enlightenment European rationalistic and scientific world-view. In view of the same Marx defines his variant of socialism to be scientific socialism. However, Shariati tries to challenge the validity of the very assumption of post-Enlightenment European thought. He does not deny it methodologically necessary to accept either the supremacy of reason or of experimental method. For Shariati sociopolitical and ethical imperatives demand to postulate a metaphysical vision which can be structured only on faith.

For Shariati, Marxism is not a coherent explanation for the doctrines of dialectical materialism, historical materialism, alienation at are not based on sound historical or sociological data. Marxism did not arise out of an empirical study of economic processes in modern society. Marxism, according to Shariati, grew basically out of a transformation of Hegelian Dialectical philosophy. Marxism may be seen as Hegelianism inverted. Marxism is not a positive science as claimed by Marx. Marxism actually has its deep origins in the myths of communism, classless society, stateless society, delineation, dictatorship of the proletariat etc. the utopias that are impossible of realization in the ongoing human historical march. However, these mythical and utopian ideals gave Marxism a full-fledged religious orientation and inspired millions across the globe to follow the so-called tenets of Marx. The materialistic conception of history as offered by Marx is itself a mythic vision not substantiated by any pressing sociological data or methodological evidence.

Ali Shariati contends that Marx's prescription for delineation is also faulty. His doctrine of class-war is also a mythical dramatization between labor and capital. The dehumanization and alienation cannot be ended through the establishment of the dictatorship of the proletariat, but through the

establishment of institutional mechanisms leading to the discovery and stability of man's inalienable commitment to God through the appropriation of values and principles enshrined in the Quran.

REFERENCES:

☆ Shariati, A. (1980) Marxism and other western fallacies Trans. R. Campbell (Contemporary Islamic thought, Persian series. Ed. H. Algar). Berkeley: Mizan Press, p. 06.

☆ Guttmann, R. (2008) Reformist Voices of Islam: Mediating Islam and Modernity. ME Sharpe, pp. 08-32.

☆ Buck-Morss, S. (2003). Thinking past terror: Islamism and critical theory on the left, Verso, pp. 41-63.

☆ Shari'Ati, A., &Algar, H. (1979). On the sociology of Islam: Lectures, Mizan Press.

☆ Ibrahim, M. M. (2008) Sociology of Religion, s PHI Learning Pvt. Ltd.

☆ Behdad, S. (1995) Islamization of economics in Iranian universities.International Journal of Middle East Studies, 27 (02), pp. 193-217.

☆ Vanda, F. (1999) Metaphysical foundations of Islamic revolutionary discourse in Iran: Vacillations on human subjectivity Critique: Journal for Critical Studies of the Middle East, 8 (14) pp. 49-73.

☆☆☆

A Glance at:-Ahmad Gulchin-i Maani's Life and Works(1)

S. Naqi Abbas (Kaify)
Research Scholar, CPCAS, JNU, New Delhi.

Ahmad Gulchin-i Ma'ani was a contemporary Iranian researcher, critic, bibliographer and poet. He was born on 18th Dey 1295 Hijri Shamsi / 8th January 1917 in Tehran(1). He started his literary journey with poetry at the age 13 and two years later succeed to publish his first poem that was written in the vilification of opium at the instance of his brother and a manager of a company of hosiery where scores of workers were addicted to opium(2).

After completing his primary and intermediate education he got into job. He held different administrative and judicial posts in the Ministry of Justice. Meanwhile, he also sustained his education. He also worked for sometimes in the Majlis and Malik libraries and catalogued some of the majmuas (miscellanea manuscripts) of the Majlis Library(3). He sought voluntary retirement in March 1964(4) and engaged himself completely in academic activities.

In August 1964, on invitation of the Astan-i Qods-i Radavi(5) library, Gulchin-i Ma'ani shifted to Mashhad. There he indulged in preparing catalogues of Persian manuscripts. He worked in the Astan-i Qods-i Radavi library for about 12 years and according to him, he spent about 25 years of his life in the libraries of Majlis, Malik and Astan-i Qods and besides other research works he prepared five significant catalogues of Persian manuscript(6).

Gulchin-i Ma'ani was very active throughout his life and in addition to his academic engagements he zealously used to partake in literary gatherings that provided him with the opportunity to meet other poets and scholars of his time. Gulchin-i Ma'ani has also wrote satirical verses under different pseudonyms like Ashaar al-Mamalik, Bacha Maktabi, Gul Agha, Lajbaz, Nowcha, Sejaf-i Daftar, Sariq-i Diwan and Simorg(7).

Ahmad Gulchin-i Ma'ani passed away on 16th Ordibehisht 1379

AH(8) / 5th May 2000 AD in Mashhad and is buried in the graveyard of the mausoleum of Ferdowsi at Tos.

He was a prolific writer and poet and has penned a large number articles and books on diverse topics. He was one of the earliest and foremost Iranian scholars who passionately paid attention towards Indo-Persian literature and wrote several research papers and books on Persian literature produced during medieval India. His works exhibit his profound interest in poetry and pre-eminent talent of editing classical Persian texts, compilation, research and criticism.

Ahmad Gulchin-i Ma'ani's works are as follows:

Edited Works:

1. Tadhkira-i Yakhchaliye: Mirza Mohammad 'Ali Bahar Isfahani, Shirkat-e Tadamini-i Haidari, 1331 AH
2. Lata'ef ut-Tawa'ef: Fakhr ud-Din 'Ali Safi, Intesharat-i Iqbal, Tehran, 1336 AH
3. Tarikh-i Mulla Zadeh Dar Dhikr-i Mazarat-i Bokhara: Ahmed bin Mohammad al-Mad'u be M'oin al-Foqara, Intesharat-i Ibn-i Sina, Tehran 1339 AH
4. Tadhkira-i Maykhaneh: Mulla 'Abd un-Nabi Fakhr uz-Zamani Qazwini, Intesharat-i Iqbal, Tehran, 1340 AH
5. Tadhkira-i Manzum-i Rushheh: Mohammad Baqar Rushheh Isfahani, Intesharat-i Amir Kabir, Tehran, 1344 AH
6. Al-Izah 'An Unul Sana'at al-Massah: Abu Mansur 'Abd al-Qahir bin Tahir bin Mohammad bin 'Abd al-Lah Tamimi, Translated by: Abu al-Fath Muntakhab al-Din As'ad bin Mahmud Isfahani, Bonyad-i Farhang-i Iran, Tehran, 1347 AH

Research Works:

7. Shahr Ashob dar Sh'er-i Farsi, Intesharat-i Amir Kabir, Tehran, 1346 AH
8. Maktab-i Wuqu' dar Sh'er-i Farsi, Bonyad-i Farhang-i Iran, Tehran, 1348 AH
9. Tarikh-i Tadhkira-hay Farsi, Vol. I, Intesherat-i Danishgah-i Tehran,

Tehran, 1349 AH

10. Tarikh-i Tadhkira-hay Farsi, Vol. II, Intesharat-i Danishgah-i Tehran, Tehran, 1350 AH

11. Golzar-i Ma'ani (Compilation of the writings of eminent Iranian personalities during the World War II), Tehran, 1352 AH

12. Tadhkira-i Paymaneh, Danishgah-i Ferdowsi, Mashhad, 1359 AH

13. Farhang-i Ash'ar-i Sa'eb, Vol. I, Moassasa-i Mohall'at wa Tahqiqat-i Farhangi, Tehran, 1364 AH

14. Farhang-i Ash'ar-i Sa'eb, (2 Volumes), Intesharat-i Amir Kabir, Tehran, 1373 AH (2nd Ed.)

15. Mazamin-i Mushtarak dar Sh'er-i Farsi: Intesherat-i Shirkat-i Pazhang, Tehran, 1369 AH

16. Karwan-i Hind, (2 Volumes), Intesharat-i Astan-i Qods-i Radavi, Mashhad, 1369 AH

17. Takmela-i Amthal wa Hekam, Intesharat-i Tasugha, Mashhad, 1378 AH

Catalogues:

18. Fehrist-i Chand Majma'a-i Ketabkhana-i Majlis Shura-i Melli, (Vth Volume), Intesharat-i Danishgah-i Tehran, Tehran, 1346 AH

19. Fehrist-i Kutub-i Khatti-i Ketabkhana-i Astan-i Qods-i Radavi, (VIIth Volume, in two parts), Intesharat-i Idara-i Ketabkhaneh, Mashhad, 1346 AH

20. Rahnuma-i Ganjina-i Quran, Intesharat-i Astan-i Qods-i Radavi, Mashhad, 1347 AH

21. Fehrist-i Qismati az Kutub-i Khatti-i Ketabkhana-i 'Abd al-Husain Bayat, (VIth Volume), Intesharat-i Danishgah-i Tehran, Tehran, 1348 AH

22. Fehrist-i Kutub-i Khatti-i Ketabkhana-i Astan-i Qods-i Radavi, (VIIIth Volume), Intesharat-i Idara-i Ketabkhaneh, Mashhad, 1350 AH

Besides the above mentioned works of Ahmad Gulchin-i Ma'ani's anthology of poetry was published as Diwan-i Gulchin, in Tehran in 1362 AH. Moreover, Gulchin-i Ma'ani edited and published 18 small treatises on various topics and wrote over 100 articles that are published in different literary magazines and journals.

References:

(1) زندگی نامه ی خودنوشت استاد احمد گلچین معانی، مجلّه ی پیام بهارستان، خرداد ۱۳۴۸ش، شماره ۴۸، ص ۳۱

(2) Ibid, p.32

(3) Ahmad Gulchin-i Ma'ani, Iraj Afshar, Encyclopædia Iranica, Vol. XI, Fasc. 1, pp 67-68

(4) Ibid

(5) The library of Astan-i Qods-i Radavi is a large library in Mashhad, Iran, established before 1457, it holds over 1.1 million volumes. It is an international center for Islamic research, containing numerous manuscripts and rare works of antiquity of Islamic history.

(6) زندگی نامه ی خودنوشت استاد احمد گلچین معانی، مجلّه ی پیام بهارستان، خرداد ۱۳۴۸ش، شماره ۴۸، ص ۳۱

(7) Ahmad Gulchin-i Ma'ani, Iraj Afshar, Encyclopædia Iranica, Vol. XI, Fasc. 1, pp 67-68

(8) یاد احمد گلچین معانی: خداوند معانی، آیینه ی میراث، تابستان ۱۳۷۹ش، شماره ۹، ص ۸۱

☆☆☆

The story of Nal-Damyanti in Persian literature

Rajesh Sarkar
Ph D. (Senior Research Fellow)
Department of Sanskrit, Faculty of Arts,
Banaras Hindu University

Introduction:

India is a country with the specialty of unity in diversity. In India there is image of multi culture, multi religion and people of India speaks different language. All these features makes India a nation which lots of nations are living. Even now days people speaks more than five hundred languages and dialects. Translation is only genre by which we can understand the ideas, the philosophy ,the thinking of other stream. As we know that a writer writes his work for the nation but a translator makes universal work. In the period of Mughal Empire during the reign of the great king of India history Akbar, is the golden era as period for the growth of the literature and culture. In spite of Akbar being illiterate. He can't even recognise the script, but his view towards literature and culture is incredible. He was more interested for the literature to be translated. A lot of work is done in the field of translation during his period. For this reason he established a translation beauro. During that period Sanskrit was main language of studies and that's because these kings were more concentrated to Sanskrit language.

As we see in the history the work of translation is done when Muslim came to India. We find the fact that translation work was done during the period of Firozshah Toghlaq. But as we have earlier said that the period of Akbar was golden era in Indian history. So work of translation was flourishing and to its last extend. Mughal's were of Turkish ethnic group but due to their leanent view they made Persian as their official language.During his period the great epics and books of Indian society Ramayana, Mahabharata , Bhagvadgita ,stories of Panchtantra Yogvashishth, Kathasaritsagar , Simhasanbattisi etc were translated from Sanskrit to Persian. Due to effect of these translation the knowledge of that period of which was previously these

knowledge and science were known to the aristocratic class and common masses knowing Persian. During this period translation work was done in the field of literature, philosophy, religion, astrology etc.

The translation of the story of Nal-Damyanti from the Mahabharat by Faizi ,was among the prestigious scholar of the Akbar's court. This love story was translated entitled MATHNAVI E NAL O DAMAN.

I tried to through the light on these topics in my research paper entitled The story of Nal-Damyanti in Persian literature.

Translation is one of the most significant means through which the western world is acquainted with the wisdom of ancient India. In the modern era if the world is aware of different branches of knowledge in India, then it has been only possible due to the large amount of translations that have been done consistently over the centuries. Through translation a person can able to understand the intricacies of other streams in their mother tongue. From ancient era many foreign travelers came to India in order to acquaint them with the rich tradition of Indian culture and especially showed a great interest in learning Sanskrit which was at that time the source of all knowledge and learning. As a result of this a large number of Sanskrit texts had been translated by the foreign scholars in their indigenous languages.

Arabian, Iranian, Chinese and Tibetan were engaged in the process of translation of Sanskrit texts during the ancient period while in the modern era it were the Europeans who translated most Sanskrit texts. Great scholar Kautilya, who was the prime minister of Emperor Chandragupta Maurya (323B.C. to 298 B.C.) once remarked.

GIRVANIISUVISALBUDDHISTATHNAYABHASARASLOLUPAHAM.
YATHASUDHAYAMAMRESUSATYAMSVARGANGANANAMDHARASAVERUCHIH

"Though I am the prominent scholar of Sanskrit but at the same time I am also eager to taste the essence of inherent in other languages, in the same way as in heaven the gods even after consumption of heavenly nectar remain always desirous to taste the nectar embedded in the lips of apsaras (virgin of paradise)(1).

Though it is true that the process of translation is not free of loopholes, but it must also be recognized that the only hope to obtain the knowledge of various fields and languages is only possible through translations. So there is no need of any testimony to proof the importance of translation.

Once in Bagdad which is known as the centre of Islamic learning when Caliph Haroon Al Rashid was suffering from some ailment then a team of Indian Vaidays (Physicians) was called for treatment of the formal. At this point of time Arabian scholars with joint collaboration of Hindu scholars translated many Sanskrit medical texts in to Arabic. The process of translating Sanskrit texts also took place in reign of Caliph Mansoor and Caliph Al Mamoon. In these works the name of Manka Pandit is most prominent.(2).

The texts translated during this time were not only related to the field of medical science but also to other fields of knowledge like astronomy and astrology were also included. In 665 A.D. Sanskrit astronomical book Khandkhadya of Brahma Gupta was translated into Arabic which was entitled Al Arkand. Albairuni once somewhere quoted that a Sanskrit book of astronomy was translated into Arabic entitled Arzbah, which was very famous in Arabia. Albairuni himself translated a book of astronomy entitled Sind Hind in 10th century.

A French astronomer Jean, Sylvain Baily (1736-1793 A.D.) says : "The motion of stars calculated by the Hindus before some 4500 years very not even a single minute from the tables were using today(3).

A famous Arab Muslim scientist of Cardova Spain Quid Sa'id (1029-1070 A.D.) says very clearly-

"Among the all nations during the course of centuries and throughout the passage of time, India was known as the mine of wisdom and fountain bead of justice and good governence, and Indians were credited with excellent intellect, exalted ideas, universal maxims, rare inventions, and wonderful talents(4).

Such translations were not only done in Arabia but also rendered by Chinese and Tibetan scholars. The most noted translators are Fa-Hien,

Hiuen-Tsang, Itsing, Lama, Taranath, Deepankar Atisha. In this golden era of Indian history Taxila, Nalanda,Vikramashila were most celebrated universities at the world level. Many students came to these universities from the different parts of Asia for the perusal of higher education. In these universities medical science Sanskrit, Pali, Prakrit, Buddhist studies, Vedic studies, Astronomy, Astrology, Philosophy, Rituals, scriptures, Religion, Music, Sclupture were the most famous subjects. Translation plays a very important role in bridging different culture and civilization.

In Indian tradition the context of Sanskrit to Persian translation is very ancient and rich. In this stream the first text of Sanskrit which was translated into Persian was Panchtantra, composed by Vishnu Sharma. It is world famous fable written, drawn as early as the second century B.C. This text had been translated into Pahalvi language before 570 A.D. by Hakim Burzoia (minister of Khushro Anusherva) during the reign of Khusru Anusherva of Sassanid dynasty(5) . But unfortunately now the book is not available. In 570 A.D. Abdollah Ibn Al Mokaffa translated the Panchtantra into Arabic entitled Kalilah Dimnah. The version of Panchtantra of the western world is based upon this translation. Molla Hussain Waiz Quasfi translated this text into Persian entitled Anuware Suheli. First poet of Persian literature Roodki Samarqandi is credited to translate Panchtantra in the poetic form. Another translation of this book in Persian entitled Kalilah Dimnah is done by Abul Ma'ali Nasrollah Munshiin 1121 A.D. A translation of Panchtantra was also composed by Abul Fazal entitled Ayare Danish during Akbar's period. In the Muslim period Persian was declared as the official and court language of India. Persian had a great prestige in Mughal period. Mughals belonged to Turkish ethnic group and they communicated with each other in Turkish. King Zahiruddin Mohammad Babur, the founder of Mughal dynasty composed his autobiography Tuzuk E Baburi in Turkish. He was also a good poet of Turkish language. But Mughals declared Persian as the official language of communication to be used in the court.

Mughal period was the golden age of Persian language and literature. Sanskrit was also very prestigious language of Indian society at that period. So

Mughals paid a lot of attention in translation of Sanskrit texts into Persian. So many tesxts of various disciplines were translated into Persian, such as Vedas, Purans, Ayurveda, Astrology, Astronomy, Philosophy, Kamasutra, Literature, Scripture etc. Original copies of many texts were ruined due to blow of destiny. But translated materials are still well protected in libraries of India, Iran and other European countries.

The reign of Akbar embarked as a very glorious for the literary movement. Works of translation were at climax. To fulfill the aim of translation, Akbar established translation bureau in his capital city Fatehpur Sikri near Agra. In this centre there were many scholars Abul Fazal, Faizi, Naqeeb Khan Badayuni, Mulla Abdul Qadir Badayuni,Maulana Ibrahim Sarhindi, Abdul Raheem Khankhana, Mulla Siri, Haji Sultan Thanesari, Raja Todarmal, Krishnadas etc.

Akbar was tolerant and of secular temperament. He respected all religions and treated them equally like his religion Islam. So the character of Akbar emerges as the most tolerant and secular king in Indian history. Many Indian historians attribute him with the title of Akbar the Great. Akbar's finance minister Raja Todarmal translated Bhagvatpurana. Raja Todarmal was a great supporter of Persian. He promoted the use of Persian in the court. Prominent scholar Abul Fazal translated the Bible into Persian, which is the sacred scripture of Christianity. Mulla Abdul Quadir Badayuni translated Simhasan Battisi(collection of Sanskrit stories)in 1574 A.D. Translation of great Indian epic, the Mahabharata was completed by a committee under the chairmanship of Mulla Abdul Quadir Badayuni. In this committee Mulla Shiri, Haji Sultan Thanesari and Naqeeb Khan Badayuni were the most notable figures. The title of this epic is Razmnama. The translation of many Parvas of Mahabharta is available in the manuscript section of our university (Banaras Hindu University,Varanasi India). Translation of the Ramayana was completed by Mulla Abdul Quadir Badayuni in 1591 A.D. A converted Muslim Bahavan or Bhavan attempted to translate the Atharvveda at court of Akbar in 1576 A.D.,but he was not able to succeeed. Later Haji Ibrahim Sarhindi completed this unsuccessful task. There have been many translations

of the Bhagvadgita. In the Akbar's period Abul Fazal translated this scripture entitled Raze Maghfirat. Krisnadas during Akbar's period compiled a Sanskrit-Persian lexicon entitled Parsik Prakashah. Not only in Mughal period but these kinds of tasks were done in the whole muslim period.

In the court of Akbar, Faizi was the most famous personality. He was a strong well known supporter of Akbar's diplomatic policies. Faizi was born at Agra in 1574 A.D.and died in 1595 A.D. at Lahore (now in Pakistan). His father was a domicile of Sivistan in Sindh province. His full name was Abul Faiz Faizi Fayyazi, but popularly he was known as Faizi. He was one among the nine gems (navratna) of Akbar's court. His elder brother Abul Fazal was a very prominent personality composed the biography of the emperor Akbar, entitled Akbarnama and Aine Akbari. Akbar established a centre for poets to exhibit their poetic intellect. First chief court poet (Malekusshoara) of this centre was Ghazali Mashhadi and after him Faizi was rewarded with this post for his whole lifetime. In the entire Mughal period he was well known for his intellectuality. In his personal library there were 4300 books. After his death these books became the part of Akbar's library. Most felicitated personalities of Persian literature in Indian subcontinent were Faizi and Ameer Khusro.

Abul Fazal and Faizi both were the supporters and assistants of Akbar's tolerance and secular policies. Mulla Abdul Quadir Badayuni due to his fanatical nature always remained envious to Faizi, but he is always influenced by his intellect. He remarked in his famous historical book Muntkhab Ut Tawarikh about intellect of Faizi-

"He was master in the knowledge of the history and there was no one who could equal his mastery over Indian mythologies(6).

He was appointed as a mathematics teacher of Prince Saleem (Jahangeer), son of Akbar. Faizi being one of the favourites of the Emperor, received his favour and was appointed as the governor of Agra, Kalpi and Kalinjar area. Faizi obtained a very respected and powerful position in Akbar's court. While in the journey of southern India Faizi died to tuberculosis. He was a very kind hearted and tolerant person and a great respect for different sects of Islam and non-Muslim. Below mentioned verse proves his nature.

SHUKRE KHUDA KEH ISHQ BUTAN AST RAHBARAM.
DAR MILLAT E BARHAMAN O BAR DEEN AZRAM(7)

"Thanks to God that in the land of Brahman and in the religion of idol worship, the love of the idols is the path bearer for me."

Faizi composed a lot of books in different styles, these books are in the following:

1-Divane Faizi 2-Mathnavi Markaze Advar 3-Mathnavi Nalo Daman 4-Bhagvadgita 5-Leelavati 6-Sawat Ul Ilham 7-Mawaradul Qulum 8-Latayafe Fayyazi

His Mathnavie Nalo Daman is the translation of the story of King Nal and his beloved Damyanti of the great Indian epic the Mahabharata. It's very popular composition in Persian literature. Although the origin of this composition is related to Vanparva of the Mahabharat but in the translated text we also find few innovations incorporated by Faizi. The story is related to Vanparva of the Mahabharat from chapter fifty eight to seventy eight. Mathnavie Nalo Daman is composed in Masnavi or Mathnavi style of the Persian literature. In this text there are fourty thousand beautiful verses. The central idea of this composition is to retain patience in difficult circumstances. In this text the love and marriage story of King Nal and his beloved Damyanti (Daman) is very attractive. Language is very simple and charming. Well known German Philosopher Arthur Schopenhauer quoted about the poetic beauty of Nalo Daman-

Here I want to so much say that according to my feeling of poem, pathos and ethos and ravishing violence of passion like sovereignty and tenderness of attribute can hardly become exceeded, it is made totally for that. To speak for old and young high and low, expert of art and for whom have their natural senses(8).

Faizi had a broad and deep knowledge about Hindu mythology and history. He had command over Sanskrit, Persian and Arabic. He was mine of wisdom and emblem of eloquence.

About his erudition Faizi himself proudly says-

AEEN QASRE SUKHAN YAFT IMARAT AZ MAN.

DARYAFT Z AHBAB V ISHARAT AZ MAN.
HAR NUQTH' MI REKHT Z NOK QULMAM.
MAANI Z KHUDA BOOD V IBAARAT AZ MAN(9)

"This palace of poetry is created by me. The guests (lover of Art) who come to this palace get directed by me. The words which emerge out of my writings are embedded no doubt mine but the meanings in them are divine."

We can feel the poetic beauty of this Masnanavi Nalo Daman after reading some translated verses -

HIND AST V HAZAR ALAME ISHQ.
HIND AST V JAHAN,JAHANE GHAM ISHQ(10)

In India, here exist thousand forms of love. India exists in the world. And the grief of world is love.

AZ RAFT E N YAFT N NAQSHE PAI.
WAZ KAS NA SUNEEDEH MAJRAI(11)

God knows through which way he went away. I am not even capable to bring back the foot prints of the bygone person.

AI ISHQ CHEH' DASHTI BE JANAM.
KAFIR O KHATTI ATISH NAHARAM.
BAS BOOD BEH SHOLEH SINEH AH
SAD BARQ ZADI TU HAM BINAGAH(12)

Oh my life what have I taken from you that you have poured fire on me. My heart is burning with flames. Why have you suddenly thrashed lighting on me?

BA ATISH O AH SOOZ NALEH
UFTAD DAMAN BE PAI E KHALH(13)

Burning with the fire of separation and prone with grief; Damyanti fell at the feet of her aunt (sister of mother).

DAR BUTKADAH TARANA E GUYAND
JANGUMSHUDA TARANA JYUAND(14)

Sing songs at the temples and search for the footprints of Nal.

From the literary point of view, Masnavie Nalo Daman is very interesting and impressive. In this composition the rules of meters follow in a systematic way.

It is the reason for which Faizi used the word Daman instead of Damyanti. Word arrangement is apt and syntax structure is very attractive. It is a treasure of figure of speech. It is a very notable composition in Iranian Persian literature.

Conclusion :

The story of Nal-Damyanti from the great epic of Indian society Mahabharata is very popular from along time . The beauty of this love story also attracted the foreign rulers. They have translated this interesting story in many languages with beauty. Even in these days MATHNAVI E NAL O DAMAN keeps very important place in Persian literature.

References:-

1- Charakya niti darpan page. 25
2- Hind O Arab Talluquat (Urdu) Page. 24
3- Hinduism : The path of ancient wisdom page. 19
4- Hinduism : The path of ancient wisdom page. 33
5- Iran sadiyo k aine me. Page 18
6- Mughal India Page. 64.
7- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 11.
8- www.amazon .com
9- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 12.
10- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 13.
11- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 19.
12- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 20.
13- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 21.
14- Dastanhaiye Dilangeez(collection of Persian stories) page 18

Sources:-

1.Nadvi, Maulana Suleman (1998) Arab Hind Talluqat, Shibli Academy Azamgarh.India.
2.Arshad, Dr. A.D. (1965) majalla Idare Tahqiqat, University of Lahore. Lahore, Pakistan.
3.Shastri, Acharya Shivdatta Mishra (1990) Chanakyaneeti darpan, Krishadas Academy, Varanasi, India.

4.Upadhyaya, Acharya Baldev (2000) Sanaskrit Sahitya ka Itihas, Sharda Niketan, Varanasi, India.
5.Gairola Vachaspati (2003) Sanaskrit Sahitya ka Itihas, Chaukhamba Vidya Bhavan Varanasi, India.
6.Dwivedi , Dr. Kapildev (2004) Sanaskrit Sahitya ka Sameekshtmak Itihas, Ramnarayan lal Vijay Kumar Allahabad, India.
7.Shukla, Chandika Prasad (1996), Naishadh Parishilan, Hindustani Academy Allahabad, India
8.Blakman (Translator) (1993) Aime Akbari, Assiatic Society Culcutta, India.
9.Ali. M. (2006) Mughal India, Oxford Press, New Delhi, India.
10.Farooqi, Salma Ahmed (2007) A Comprehensive History of Medieval of India, Darling Kinderley, New Delhi, India.
11.Azhar, Prof. A.W. (2009) Sanskrit works in Persian, Apoorva Journal Varanasi, India.
12.Goyandka, Jaydayal (2010) Nal Damyanti, Gita Press, Gorakhpur, India.
13._____ (1980) Dastan Haiye Dilangeez, Amir Kabir Tehran, Iran.
14.Vij, Rajneesh (2012) Mutunhaaiye Tarjume shode Az Sanskrit Be Farsi, University of Tehran, Iran.
15.Abbas, Dr. S.H.(1998) Chauthi Sadi Iran ka Ilmi Mahaul, Varanasi. India.
16.Badlani Hero G. (2008) Hinduism : The path of Ancient Wisdom Bloomington U.S.A.

☆☆☆

Scientific & Technical Exchange Between India & Iran

Rakesh Vij
Rakeshvij22@gmail.com

India is one of the most ancient countries of the world that is still having the oldest continuous culture and civilization. This country is having the great diversity in itself. The Indian Subcontinent including present day India and Pakistan with special geographical conditions has a deep root in producing the civilization which is settled in Deccan plateau, Punjab, Sind and Bengal. Everyone can see the traces of this civilization in the richness of the museums of Calcutta, Lahore, Peshawar, Mumbai Hyderabad and other cities of the world. It is said that the Dravidians created the Sind or Indus civilization that in the following period with the combination of the ancient civilization and cultural elements of the Aryan invaders from the North West, and cultural exchange with the neighboring civilizations like Iran, the cultural identity of India has been formed and evaluated. Despite the diversity of elements, it has tried to protect the unity and identity of Indian culture and civilization.1

Iran and Al-Hind wal Sindh (name given by muslim scholars to India) had adjoining boarders. More than any other factor geographical proximity brought them together. In the 8th and 9th centuries India contributed to the highly advanced civilization of Iran and in the following centuries, Iran gave to India elements that made this subcontinent the most desired piece of land in the world.

The present article is an endeavor to highlight the transmission of science and technology from Iran to India, following the establishment of the Delhi Sultanate till the foundation of the Mughal Empire.

The transmission of Indian works on science found their way to Baghdad long before the foundation of the Delhi Sultanate. Indian numerals, mathematics, arithmetic, medicine, pharmacology, philosophy, toxicology, astronomy and veterinary science and many other disciplines were transmitted to the caliphate. The 9th century scholar Jahiz wrote, "we have found the

Indians most advanced in astrology and mathematics. They have their own script. They are also far ahead in medicine. They have special secrets (asrar) in medicine. They have drugs for all the deadly diseases. Sculpture and painting are their special arts. Chess which is a game of great skill and intelligence is their invention. India is the fountainhead of thought and wisdom."2

With the establishment of the Delhi Sultanate the floodgates of information and technology were opened and transformed the Indian Society in several fields like textile production and use of items like paper, irrigation devices, horseshoe, gunpowder and stirrups etc. The spinning wheel known as Charkha came to India in the early period of the Delhi Sultanate from Iran. This Iranian gift is being used by the Indian weavers even now. Likewise, the wooden cotton gin, known in India as Charkhi, Belna or Resta used for the purpose of separating seeds from cotton, and to loosen and separate the cotton fibers is also an Iranian gift to India. The use of Charkha and Charkhi brought about massive increase in the quantity and quality of textile products.

In the field of agriculture the introduction of the Persian wheel which had an oval chain of buckets to pull water from deep well increased the production of food crops and other agricultural commodities. The Persian wheel with a gearing device came into general operation in the Arab world and was passed on to Europe through Spain and to India through Iran.3 As a result of the application of this irrigational device we can witness a remarkable agricultural expansion in early Medieval India.

Paper which is considered to be one of the important milestones of human civilization was manufactured in China for the first time in the first century A.D. It reached Baghdad in the 8th century. But in India it came into regular use only in the 13th century. We can see the earliest surviving paper manuscript in Persia are dated 718 A.D., while in India it is dated only 1223-24 A.D. With the establishment of the Delhi Sultanate, Delhi became another Baghdad a seat of learning, and this finally resulted in the large, scale manufacture of paper.4 The Turks wrested victory due to their political tactics. The Turks defeated the Rajputs, protected their Indian territories from the invading Mongols, since they could meet the enemy on an equal footing,

equal military technology, the use of the iron stirrup and iron horseshoe, technological innovations which came to India from Iran.

The iron stirrup reached Iran from china towards the end of the 7th century. It came to India through the Turks. Because of the iron stirrup the Turks used the bow from the saddle while moving on a speeding horse. They could also use two weapons while holding the reins in the mouth and throw the lance in a reverse direction. Another technique of increasing the striking power as well as the stamina of the horses was the iron horse shoe, which though reached Iran later was in full use when the Turks established their empire in India. After some years the Rajputs also began the use of the above two devices.

Another important element of war technology was the use of gunpowder, which also came to India during the Sultanate period from western neighbors. Guns were fired on the western coast of India much before Babur's guns thundered at Panipat in 1526A.D. The implications of the use of gunpowder are obvious.6

In the field of physical sciences also there was a cross transmission between India and Iran. In the growth of science and learning, India and Greece contributed equally during the period of the Abbasids. Sanskrit and Greek traditions thus absorbed at Baghdad came back to India and Europe as a finished product.7

'Arrisalah fil Kimia' (1020A.D) was a short treatise alchemy by Bu Ali Sina famous as Avicenna in west. The manuscript is available in the Khuda Bakhsh Library, Patna. The book on chemistry was brought to India from Iran and helped in dyeing and bleaching in textiles, cutting and polishing of stones and manufacture of metallic stones.

In the field of physics & metaphysics seventeen of works of Avicenna are available in India. His treatise namely "Arrisalah Fil Bayan-e- Asbabur Ra'd wa'l - Barq" (on the causes of thunder and lightning) and "Ashshifa'ul-IIahiyat" (on motion contact force vacuum, infinity, light heat and specific gravity) are remarkable gift to Indian science.

In the field of mathematics also the works of Avicenna and other

Arabic and Persian writers found their way to India. The work of Avicenna namely "Danesh Nameh Ala'I (on geometry) was well accessed in India. The book namely "Al-Fawaidul - Baha' iyyah" is a very useful work on arithmetic, geometry, determination of areas, volumes and inheritance, authored by the famous scholar ' Abdullah Al- Bag hadi Al- Khadami is also an Iranian contribution to India.

Although there existed intellectual communications existed between India and Iran, but it is a matter of surprise that works on agriculture, horticulture and botany did not find their way to India from Iran. The famous "Kitabush Shifa" dealing with logic, physics, mathematics, astronomy, plants, metaphysics and animals, authored by Ibn Sina is again a remarkable Iranian contribution to India.

The encyclopedic work namely "Danish Namhai Jahan" dealing with natural philosophy, mineralogy, botany, psychology, anatomy, vapours, rain, wind, thunder and meteors etc. written by Ghayasuddin Isfahani was made available to the Indians during the Sultanate period, accelerated the Indian minds in these fields.

In the field of medicine also number of Persian and Arabic works paved their way to India and they were used by Indian physicians or teachers and are still recommended books for the students of Tibbiya or Unani institutions in Indian subcontinent including today's India, Pakistan & Bangladesh. Among them the book of Abu Bakr Muhammad Bin Zakaria Razi named "Kitab Burus Sa'at" in Arabic, the Risalah Fi'l Tahaffuz Mina'n - Nazalah, a book on the treatment of colds, in Arabic, the Risalah Dar Khawas-i- Haywanan" in Persian on the curative properties of the flesh of different animals, the "Hadayatul Muta" in Arabic meant for initiating students in the study of medicine, the Risalah Fi't Tibb a treatise on medicine written in Arabic, the Al- Adwiyatu -Qalbiyah by lbn Sina on cardiology etc. are remarkable.

There is hardly any doubt in the fact that Iranian influence on Indian works especially on Unani medicine becomes very obvious during the Sultanate period. Besides, there were also a fairly large number of physicians who migrated to India where they had established themselves in the field of

medicine.

From the above discussion it is evident that there exists deep and profound influence of Iran on India in the esoteric and allied fields of science and medicine. It can be concluded that the deep affinity between these two countries sharing the same social root upgraded enormously in the field of science & technology during the Sultanate period.

References:

1. Tarachand Dr., The Effects of Islam on Indian Culture, translated in Persian, Pajang, Tehran, Iran, 1995, pp. 27.
2. Nadvi, India in Arabic Literature (Urdu) Vol.1, p. 4-5.
3. Nadeem, Science and Civilization, Vol. IV, p.352
4. Indo-Iran Relations, Civilization & Cultural Co-operation, Culture House of the Islamic Republic of Iran, Mumbai. p.182.
5. Ibid, p.184.
6. Ibid, p.185.
7. Ibid, p.185.
8. Iran wa Hend (Persian) by Ms. Leila Amini, journal No: 176, 1391. P-53,54.

☆☆☆

JAHAN-E-URDU

Munazir Haque badauni
Co-editor DABEER

We respect the worthy opinions of our teachers from the outside of India. The quarterly journal Dabeer that is been publishing from Dabeer Hasan memorial library kakori, Lucknow, India in the Urdu language. We are happy to inform you that now the same journal will be published in two languages (Urdu and English). In this column we will take a brief survey of the research papers of Urdu language for our readers and scholars who are residing outside of India and unable to understand the Urdu language.

In the preface, activities related to Persian language and literature of all over India described briefly. Such as, the twenty one days workshop of manuscript logy and paleography was held successfully in Banaras Hindu University and a report of some national and international seminars that were held in Delhi University, Aligarh Muslim University, Lucknow University, Mumbai University, Maulana Azad Arabic Persian Institute and Institute of Indo-Persian Studies, Bombay is given in this section.

Renowned & Eminent scholar and manuscriptolgist Dr. Arif Naushahi highlighted the research related to Shahnama and indo- pak subcontinent in his article entitled "Firdausi Tusi and his Shahnama". The second article is entitled "Story of Script" by Dr. Mohd Aqueel, Assistant Professor Persian Banaras Hindu University, Varanasi. In his research paper he gave detail information of the script of Arabic, Persian and Urdu. He wrote about each and every script that is prevalent today or before. The third article is entitled "A brief survey of Tadkerah Nikat-u- Shora" of Dr. Rana Khursheed, department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh (India). The fourth article is written by Dr. Fakhre Alam azmi, Department of Urdu, Khwaja Moinuddeen Chishti Urdu, Arbi, Farsi University, Lucknow (India) entitled " A Great Poet Rizwan Saeed". The fourth article is entitled " A Persian Poet of Awadh-Muzaffar Ali Aseer" written by Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Lucknow (India). In her research paper she discussed about the life as well as Persian

poetry of Aseer. The sixth article is entitled Fawaid-ul- Fawaid written by Dr. Shabeeb Anwar Alvi Kakorvi, Lucknow. In his research article he took a brief survey of Fawaid-ul- Fawaid- Malfuzat of Hazrat Nizamuddin Aulia edited by Hazrat Hasan Sijzi. The next article is on "Dara Shikoh" written by Mr. Mohd Qamar Alam, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh. The next article is entitled "Miraz Akmaluddin Badakhshi: Life & Works" written by Mr. Sarfraz Ahmad, Research Scholar, Jamia Millia Islamia, New Delhi (India). The ninth article is entitled "Tasawwuf & Meer Wahid Bilgirami" written by Mohd Umar, Research Scholar, Department of Arabic and Persian, Allahabad University, Allahabad (India). The tenth article is entitled " Nasir Ali Sarhindi & his poetry" written by Nazra Ishaq, Research scholar, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh (India). The eleventh and last research article is entitled "Hazrat Mohd Rasheed Mustafa Usmani & his poetry" written by Arman Ahmad, Research scholar, Department of Arabic, Banaras Hindu University, Varanasi. In this research paper he discussed about Persian poetry of famous sufi poet Mohd Rasheed Mustafa Usmani Jaunpuri.

DAKANIYAAT

In this section of the Journal Dr. Sayyida Asmath Jahan, Assistant Professor, Department of Persian, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad (India) discussed in her research paper entitled "Went But Not Our Heart"about the life & contribution of three Hyderabadi Professors of Persian Language and literature who are died recently.

MEERAAS-e-KHATTI

In this section, there is a description of some important manuscripts that are preserved in different libraries of India. Mohd Irshad Alam, Research Scholar, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh, wrote on the "Manuscripts of Khulasatul Twareekh". And Riyaz Ahmad, Research Scholar, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh give the detail of "Some Important Manuscripts of Zakheeratul Muluk in India".

AINA-e-TAHQEEQ

In this column, there is a list of thesis that have been submitted in the Department of Persian, Allahabad University, Allahabad (India) prepared by Abida Khatoon, research scholar, department of Arabic and Persian, Allahabad University, Allahabad.

CASHME BEENASH

In this column, there is review by the editor on the book "Sharah-e-Qasaid-e-Khaqani" written by Prof. Shameem Akhtar.

☆☆☆

ISSN : 2394-5567

DABEER

(An International Peer Reviewed Quarterly Literary Refereed Journal for Persian Literature)

Volume : 2 April to June 2015, S. No. 2

From : Dabeer Hasan Memorial Library

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Research Scholar, Dept. Of Persian, AMU, Aligarh

Ad.: Dabeer Hasan Memorial Library
12, Choudhri Mohalla, Kakori, Lucknow (U.P.) 226101

Mob. 09410478973, email:dabeerpersian@rediffmail.com

BUY AN
AFFORDABLE & QUALITY HOME
IN DELHI-NCR

Care Group

THE ALIEN COURT

TRANS DELHI, SIGNATURE CITY

2 & 3 BHK
LUXURY APARTMENTS

Rs. 3300/-sq ft (BSP)

Alien Court Features

- Excellent Location
- Land allotted by U.P.S.I.D.C. for group housing
- Eco - friendly layout of project
- Wide Open space with wide internal roads
- Central Park spread over around two acre
- East facing, three side open corner plot
- 80% of Flats are either park facing or corner
- Vastu friendly layout
- 24x7 High Tech Security
- 27x7 Electricity & Water supply
- Dedicated Car Parking*
- High Speed Elevators in each cluster block
- Provision for rain water harvesting
- Daily need shops
- 100% Power backup for common premises
- In-house maintenance

85% CONSTRUCTION COMPLETE
NO MORE WAITING FOR YOUR DREAM HOME
NO MORE LIVING ON RENT
PAY ONLY 20% & 80% BANK LOAN AVAILABLE
ALL MODERN FACILITIES
SIGNATURE BRIDGE A WORLD CLASS INFRASTRUCTURE & TOURIST ATTRACTION
0 KM FROM DELHI BORDER
10 KM FROM DELHI UNIVERSITY

Contact Mr. Ashraf Ali M.: 09335638874, Email- ashrafali150@gmail.com

Banking Partners :
केनरा बैंक Canara Bank
DHFL Changing Rules Changing Lives
HDFC BANK

Dakshya Infra Developers Pvt. Ltd.
Delhi Office : C4C/395, Janakpuri, New Delhi-110058
E-mail : info@caregroup.info, **Web. :** www.caregroup.in
Regional Office : Plot No. A-12, Sector-C8, Tronica City, Ghaziabad, UP
Site Off. : C-3/1, Tronica City, Ghaziabad (NCR)